روزانہ درسِ قرآن پاک

○

تفسیر

سُورَةُ الْفَاتِحَة

(مُکمّل)

○

(جلد: ۱)

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

تیرھواں ایڈیشن

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ فاتحہ) جلد ا

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب .... الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... ایک ہزار (۱۰۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... -/۱۰۰ ایک سو روپے

تاریخ تیرھواں ایڈیشن .... صفر المظفر ۱۴۲۹ھ بمطابق فروری ۲۰۰۸ء

(۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

(۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد

(۹) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ

(۱۰) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ فاتحہ) جلد ۱

پیش لفظ

طبع اوّل

از: الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیۡنَ وَعَلٰۤی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ (قرآن حکیم)

خَیۡرُکُمۡ مَّنۡ تَعَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ وَعَلَّمَہٗ (حدیث پاک)

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور علم وحکمت کا بے پایاں خزانہ ہے۔ نوع انسانی جس حد تک اس کے قریب ہوگی اُسی قدر اُس کے لیے سعادت و فلاح کے دروازے کھلیں گے قرآن پاک کا پڑھنا، سمجھنا، اس کی تعلیمات کے مطابق اپنے فکر وعمل کی اصلاح کرنا، وقتی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، سلف صالحین کے طریقہ پر اس کی تشریح و تفسیر کر کے عوام الناس کو اس سے مستفید کرنا باعثِ سعادت اور مدارِ فوز و فلاح ہے۔

روزانہ درس قرآن پاک ہر زمانے میں علماء کرام کا معمول رہا ہے۔ چنانچہ سلف صالحین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صوفی عبدالحمید صاحب مدظلہ العالی نے درس قرآن پاک کا آغاز تقریباً آج سے تیس سال پیشتر جامع مسجد نور، نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ میں کیا۔ صوفی صاحب ہفتہ میں چار یوم بعد از نماز فجر درس دیتے ہیں اس عرصہ میں قرآن پاک کا مکمل درس پانچ مرتبہ دیا جا چکا ہے۔ اور اب چھٹی دفعہ اس کا آغاز ہو چکا ہے ہفتہ کے باقی ایام میں حدیث پاک کا درس ہوتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور

نسائی شریف، ابن ماجہ، مشارق الانوار، الترغیب و الترہیب کا درس مکمل ہو چکا ہے۔ اور اس وقت مسند احمد کا درس جاری ہے۔ صوفی صاحب کا درس قرآن پاک کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ قرآنِ پاک کی تفسیر مفسرین و محدثین کرام کے مرتب کردہ اصول تفسیر اور سلف صالحین کے مطابق بیان فرماتے ہیں۔ اور حتی الامکان غیر ضروری بحث سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہ آیت زیرِ درس اور اس سے متعلقہ موضوع پر مرکوز رکھتے ہیں۔ اُن کے مفید طرزِ بیان اور موضوع سے والہانہ محبت و لگاؤ نے بعض سامعین کو مجبور کیا کہ آپ کے بیانات کو ٹیپ کے ذریعے محفوظ کر لیں۔ تاکہ جب چاہیں سن کر ایمان کو تازہ کر سکیں۔

اس سلسلہ میں محترم الحاج منیر احمد نار صاحب اور عزیزم بلال احمد ناگی صاحب کی مساعی قابلِ ستائش ہیں جنہوں نے گذشتہ دورہ درسِ قرآنِ پاک کے آخری حصہ سورۃ حشر تا سورۃ الناس کی ریکارڈنگ مکمل کی اور موجودہ دورۂ درس میں ابتداء سے ہی یہ کام باقاعدگی سے سرانجام دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

جب بہت سی کیسٹیں جمع ہو گئیں تو ان میں محفوظ مضامین سے مستفید ہونے کے لیے انڈیکس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاکہ جب بھی کوئی حصہ سننا مطلوب ہو متعلقہ کیسٹ آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ چنانچہ محترم الحاج غلام حیدر صاحب نے تجویز پیش کی کہ انڈیکس کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیئے کہ اس میں کیسٹ کا نمبر، قرآنِ پاک کا پارہ، سورۃ، رکوع، آیات نمبر اور خلاصہ بیان ہو جائے۔ اس کام میں طبع آزمائی کے لیے انہوں نے میری خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہا۔ چنانچہ احقر نے سورۃ حشر تا سورۃ تحریم کے درسوں کا انڈیکس بطور نمونہ پیش کر دیا۔ جسے محترم صوفی صاحب نے بھی پسند فرمایا۔

مذکورہ کام سرانجام دینے کے دوران خود میں نے یہ محسوس کیا کہ تیار کردہ انڈیکس سے صرف وہی اصحاب مستفید ہو سکیں گے جن کے پاس کیسٹ ریکارڈ موجود ہوگا۔ اور اگر محض خلاصہ درس کی بجائے مکمل درس کو کتابی شکل میں پیش کر دیا جائے تو اس سے وہ تشنگان بھی سیراب ہو سکیں گے جو بوجوہ درس میں باقاعدہ حاضری سے قاصر ہیں (اسی دوران محترم الحاج منیر احمد نار صاحب نے شب و روز کی ذاتی کاوش سے موجودہ دورۂ قرآن پاک کا کچھ ابتدائی حصہ کیسٹ سے کاغذ پر منتقل کر کے جواہر کی علمی تفسیر پیش کر دی۔ بلاشبہ ان کی یہ محنت قرآن پاک سے والہانہ محبت کا زندہ ثبوت ہے۔

ان دروس کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی تجویز جب صوفی صاحب محترم کی خدمت میں پیش

کی گئی تو انہوں نے نہ صرف اسے سراہا بلکہ بعض سلف صالحین کی اتباع میں اس خواہش کا اظہار بھی فرمایا کہ ابتداء میں اگر سورۃ فاتحہ اور قرآن پاک کے آخری دو پارے مکمل ہو جائیں[1] تو زیادہ موزوں ہوگا۔ چنانچہ اس کام کی تکمیل کے لیے صوفی صاحب کی نظر انتخاب اس ناچیز پر پڑی جسے باعث سعادت تصور کرتے ہوئے قبول کر لیا گیا۔ اور احقر نے اپنی اولین فرصت میں دس درسوں پر محیط سورۃ فاتحہ کو نہ صرف کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ بلکہ حسب ضرورت جگہ جگہ موزوں سرخیاں لگا کر مضامین قرآن پاک کو اجاگر، پرکشش اور ان کی افادیت میں اضافہ کی کوشش بھی کی ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

اس کار خیر میں حصہ لینے والے مذکورہ بالا کارکنان اپنی اس کاوش پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ قرآن پاک کا یہ حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن پاک کے حقائق و معارف کو جس سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے عوام الناس کا اس سے محروم رہنا افسوسناک ہوتا۔

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اس سلسلہ میں اگر انہیں کوئی واضح غلطی نظر آئے یا وہ کوئی کمی محسوس کریں تو وہ ہمیں مطلع فرمائیں، تاکہ اسکی اصلاح کی جا سکے۔

قرآن پاک کے آخری دو پاروں پہ کام شروع ہو چکا ہے جوں جوں کام مکمل ہوتا جائے گا۔ قارئین کی خدمت میں پیش ہوتا رہے گا۔ صوفی صاحب کی اپنی آواز میں اصل کیسٹ بھی محفوظ ہیں صاحب فوق حضرات اگر ان سے مستفید ہونا چاہیں تو یہ کیسٹ اپنی اصل لاگت کے حساب سے پیش خدمت ہوں گے جو کہ ناخواندہ حضرات کے لیے خاص تحفہ ہیں۔ اس قسم کی چیز بیرون ملک اپنے اعزہ و اقارب کو بھیج کر حدیث پاک خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ کا مصداق بنا ہے۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ اس کار خیر میں حصہ لینے والے کارکنان کے لیے استقامت کی دعا کریں۔ واللّٰہ الموفق۔

احقر العباد

(الحاج) لعل دین ایم اے (علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور

---

[1] الحمد للہ اب یہ دونوں پارے طبع ہو چکے ہیں۔ بلکہ پورے قرآن کریم کی مکمل تفسیر ۲۰ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ (فیاض)

طبع چہارم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

سلسلہ دروس القرآن کے قارئین حضرات جانتے ہیں کہ اس سلسلہ کی ابتدا کن حالات میں ہوئی ان دروس کو کیسٹ سے قرطاس پہ منتقل کرنے کا خیال کس طرح پیدا ہوا اور پھر اللہ تعالیٰ نے خدمتِ قرآن کے لیے مخلصین کی ایک جماعت پیدا کر کے اُسے کامیابی بھی عطا فرمائی۔

دس دروس پہ مشتمل سورۃ فاتحہ کی اولین اشاعت ۱۹۸۱ء میں ہوئی۔ یہ سلسلہ دروس القرآن کی ابتداء تھی۔ اس کے بعد طبع دوم ۱۹۸۳ء میں اور طبع سوم ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس دوران میں حضرت صوفی صاحب مدظلہ قرآن پاک کا درس مکمل کر کے واپس سورۃ فاتحہ پر آچکے تھے۔ پورے کا پورا قرآن کریم صوفی صاحب کی بیان کردہ تشریحات و توضیحات کے ساتھ کیسٹ پہ محفوظ ہو چکا تھا اور دوبارہ ابتداء سے کیسٹ کرنے کی ضرورت نہ تھی، تاہم بعض معتقدین کے اصرار پر سورۃ الفاتحہ کے دروس دوسری بار پھر کیسٹ پہ اُتار لیے گئے۔

اللہ جل شانہٗ جب کوئی کام کروانا چاہتا ہے تو پھر اس کیلیے اسباب بھی پیدا فرما دیتا ہے سورۃ فاتحہ کے متعلق بھی بعض احباب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ دوسری مرتبہ کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں کو بھی کاغذ پہ منتقل کر کے دیکھا جائے کہ دونوں مرتبہ کے بیان میں کس حد تک فرق ہے۔ چنانچہ یہ سعادت پھر بندہ ناچیز کو حاصل ہوئی جب ان کیسٹوں کو قرطاس پہ منتقل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس مرتبہ سورۃ فاتحہ دس دروس کی بجائے انیس دروس تک وسیع ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مرتبہ اس میں مزید تفصیلات شامل ہو گئیں، لہٰذا کارکنانِ سلسلہ دروس القرآن نے محسوس کیا کہ عام قارئین کو ان تفصیلات سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ سورۃ فاتحہ کی دس دروس پہ مشتمل چوتھی طباعت کی بجائے انیس دروس پہ محیط یہ جلد شائع کی جائے۔ پہلی کتابت میں عنوانات جلی قلم کے ساتھ صفحات کے درمیان میں دیے گئے تھے مگر اب باقی جلدوں کی مناسبت سے سورۃ فاتحہ

کے عنوانات بھی حاشیے پر منتقل کر دیے گئے ہیں۔

جہاں تک سورۃ فاتحہ کے مضامین کا تعلق ہے اسے اَعْظَمُ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ وَاٰخِيْرُ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ کہا گیا ہے کیونکہ اس سُورۃ میں پورے قرآنِ پاک کا خلاصہ آگیا ہے۔ سورۃ فاتحہ کو دیباچہ قرآن بھی کہا گیا ہے۔ مفسرین اس کی مثال آئینے کے ساتھ دیتے ہیں جو ہر چھوٹی بڑی چیز کو ظاہر کر دیتا ہے۔ مفسرین کرام نے اس سورۃ کے پندرہ نام بیان کیے ہیں جن میں سے ہر نام سورۃ کی کسی نہ کسی صفت کو ظاہر کرتا ہے۔

چونکہ اس سُورۃ سے قرآن پاک کی ابتداء ہوتی ہے اس لیے آدابِ تلاوت کے ضمن میں تعوذ اور بسم اللہ کی اہمیت کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا۔ سورۃ الصلوٰۃ ہونے کی نسبت سے نماز میں سورۃ فاتحہ سے متعلق ضروری مسائل بھی بیان کر دیے گئے ہیں توحید خداوندی اور صفاتِ باری تعالیٰ اس سورۃ کے خاص موضوع ہیں جنہیں شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ آخر میں فلسفہ دُعائے صراطِ مستقیم اچھوتے انداز میں پیش کر کے معترضین کو مسکت جواب دے دیا گیا ہے۔ بغرضیکہ قارئین کرام اِن اسباق کو ایک ایسا گلدستہ پائیں گے جس میں دین سے متعلق ہر رنگ اور ہر بو کے پھول ملیں گے۔

سلسلہ دروس القرآن کی اشاعت کا کام جاری ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ اس نے اس عظیم کام کے لیے کارکنانِ مکتبہ دروس القرآن کو منتخب فرمایا ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس سلسلہ کی جلد از جلد تکمیل کے لیے دُعا کریں۔ نیز حضرت مولانا صوفی صاحب مدظلہ کی صحت اور درازی عمر کے لیے دُعا کریں جنہوں نے زندگی بھر کا اثاثہ ہر خاص و عام کو پیش کر دیا ہے۔

احقر العباد

لعل دین

ایم اے "علوم اسلامیہ"
شالامار ٹاؤن لاہور

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

سخنہائے گفتنی

(طبع چہارم)

از

محمد اشرف فاضل مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ ، وفاق المدارس العربیہ پاکستان

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ :- اَمَّا بَعْدُ

زندہ اقوام کے لیے آزادی سے بڑی کوئی نعمت اور غالباً غلامی سے بڑھ کر لعنت اور منحوس کوئی چیز نہ ہوگی۔ خصوصاً اس قوم کا غلام ہونا جس نے اقوام عالم کو آزادی کا درس دیا اور انسانیت کو غلامی کے منحوس اثرات سے نجات دلا کر آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا ہو۔ جس کے راہبر، ہادیٔ اعظم اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جنہوں نے پوری انسانیت کو، دینی اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور دیگر بنیادی حقوق کی اعلیٰ اقدار سے روشناس کرایا۔

اور غلامی بھی ایسی اقوام کی جو درندگی، اخلاقی گراوٹ میں اپنی مثال آپ ہیں، جو اپنے سوا تمام اقوام کو انسانیت سے خارج اور جانوروں سے بھی بدتر سمجھتی ہیں، جو اربوں انسانوں سے اُن کی تجارت دستکاری، دولت، حکومت، عزت، خوشحالی، زمینیں، علوم، اجتماعی شان وشوکت، ذہنی اور فکری آزادی چھین کر صرف اور صرف اپنا پیٹ بھرنا اور عیاشی میں بے تحاشا دولت خرچ کرنا جانتی ہوں اور صرف رنگ ونسل کے فرق سے خون کی پیاسی ہو جاتی ہوں جس کی وحشیت، بربریت اور درندگی کی شہادت آج بھی اندلس، غرناطہ، قرطبہ، اسپین، سیسلیا، مالٹا، سوریہ، بلقان، فلسطین، ہندوستان اور ارض پاک کی تاریخ دے رہی ہے۔

بدقسمتی سے آزادی کے کچھ ہی دیر بعد سودی قرض سے لے کر وطن عزیز اور اس کے اہالیان کو اسی قوم کی سیاسی ذہنی اور معاشی غلامی میں دیدیا گیا، جس سے لاکھوں قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کی تھی، اس قرض سے گو فائدہ وہ مٹھی بھر افراد اٹھاتے ہیں جو بنک سے قرضہ لے کر اثر رسوخ کے ذریعے معاف کرا لیتے ہیں یا پھر انہی قرضوں کے ذریعہ بیرون ملک خریداریوں پر کمیشن کے ذریعہ یا مختلف منصوبوں پر ٹھیکے دیتے یا لیتے وقت خوب دولت اکٹھی کرتے ہیں، جو یقیناً پہلے ہی بڑے بڑے افسر یا مالدار ہوتے ہیں۔ لیکن پوری قوم کو اس کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

داخلی طور پر ہماری بے بسی، اور سیاسی غلامی کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہوگی کہ وفاقی وزیر داخلہ امریکی سفیر کو وائسرائے کا لقب دینے اور اس کے تبادلے کی درخواست کے باوجود اسے تبدیل کرانے میں ناکام رہے ہے۔ اور وطن عزیز میں ہزار خواہش کے باوجود عوام اپنی مرضی سے کسی محب وطن کو برسراقتدار نہیں لا سکتے بلکہ امریکہ اور یورپ کی پالیسیوں پر عمل کرنے والے ہی برسراقتدار آسکتے ہیں اور وہی برسراقتدار رہ سکتے ہیں۔ یہی حال دیگر اسلامی ممالک کا بھی ہے۔ جو یورپ یا روس کے اتحادی بننے پر مجبور ہیں۔ حالانکہ امریکہ اور روس دونوں طاغوتی طاقتیں ہیں۔

معاشی غلامی اور بے بسی کی اس سے بڑھکر اور کیا دلیل ہوگی کہ ہم اپنی مرضی سے اپنا بجٹ بھی تیار نہیں کر سکتے۔ "اس سال ہمارے تیار کردہ بجٹ کے اعداد و شمار اقوام متحدہ کے ادارہ آئی ایم ایف نے مسترد کر دیے (نوائے وقت ۱۰ مئی ۱۹۹۰ء)

ان قرضوں سے ہم اس قدر دب چکے ہیں کہ ہمیں اپنے دفاع سے زیادہ رقم سود کی ادائیگی پر خرچ کرنا پڑتی ہے۔ جب کہ ہمارے مجموعی غیر ترقیاتی اخراجات کا ۸۰/۔ فیصد حصہ دفاعی اخراجات پر خرچ ہوتا ہے۔ (وفاقی وزیر خزانہ، نوائے وقت ۹ جون ۱۹۹۰ء)

اس سال حکومت نے چھتر ارب روپے خسارے کا بجٹ تیار کیا تھا۔ جن میں بارہ ارب پچانوے کروڑ روپے کے نئے ٹیکس لگائے گئے۔ وفاقی حکومت نے آئندہ سال کے لیے اڑسٹھ ارب روپے سود کی ادائیگی کے لیے مختص کیے تھے، لیکن آئی ایم ایف نے فوری طور پر شرح سود ایک فیصد زیادہ کر دی جس سے پچاس سے ساٹھ کروڑ روپے زیادہ ادا کرنے پڑیں گے۔

گویا کہ سیاسی، ذہنی اور معاشی غلامی نے ہمیں ان آہنی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے جس سے آنے والی نسلیں بھی نکلنے کے بجائے اور زیادہ جکڑتی چلی جائیں گی۔ اس وقت امریکہ اور یورپ ہمارے سامنے بنیئے سے بھی بڑے ساہوکار کی شکل میں موجود ہے۔

انہی قرضوں کی وجہ سے خارجی طور پر بھی ہم امریکہ اور یورپ کی مکمل حمایت کرنے پر مجبور ہیں۔ اسرائیل کی مکمل پشت پناہی اور سیاسی، اقتصادی، گویا ہر طرح کی مکمل امداد امریکہ اور دیگر یورپین ممالک کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسرائیلی مظالم کے خلاف اقوام متحدہ میں زبانی مذمت کی قرارداد کو امریکہ غالباً تین بار ویٹو کر چکا ہے۔

ہم یہ سمجھنے کے باوجود کہ اسرائیل مسلمانوں کا کتنا دشمن ہے، ہر روز اس کے ہاتھوں مسلمان مردوں عورتوں کے اغوا وقتل اور بچوں کے ذبح ہونے، ان سے چھینے ہوئے علاقوں میں یہودیوں کی آبادکاری اور پوری دنیا میں کروڑوں مسلمانوں پر یورپین یا ان کے اتحادیوں کے مظالم کی خبریں سننے کے باوجود اُف تک نہیں کر سکتے بلکہ نہ چاہتے ہوئے بھی امریکہ اور یورپ کے اولین اتحادیوں میں کھڑے ہونے پر مجبور ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس ذہنی، سیاسی اور معاشی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ قربانیاں دینی پڑیں۔

زیر نظر کتاب تفسیر سورۃ فاتحہ میں استاذی المحترم حضرت صوفی صاحب دام مجدہم نے ان تلخ حقائق کو بڑے سادہ عام فہم الفاظ اور انتہائی اچھے انداز میں بیان فرمایا ہے صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر کرتے ہوئے قرآن پاک اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنے کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا ذکر کرتے ہوئے حضرت کہتے ہیں۔

"ان کے عملی نمونے زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں، معاملہ صلح کا ہو یا جنگ کا، عبادت کا مسئلہ ہو یا معیشت، معاشرت اور تجارت کا، ہر جگہ ان کا نمونہ موجود ہے۔"

کچھ اور آگے چل کر حضرت یہ الفاظ ذکر فرماتے ہیں۔

"آج مسلمانوں کی یہی حالت ہے، جو قوم آج اپنے اصول وضوابط اور نمونے کو

چھوڑ کر دوسروں کے محتاج ہیں، محض فلسفہ جھاڑتے ہیں۔ عمل کا فقدان ہے، وہ کامیاب نہیں ہو سکتی، آج مسلمانوں کی کوئی چیز اپنی نہیں، سیاست، معیشت، معاشرت، تجارت ہر کام میں امریکہ اور یورپ سے ہدایات حاصل کرنے والے اور ان کے نمونے پر چلنے والے انعام یافتہ گروہوں میں شامل نہیں ہو سکتے۔"

حضرت صوفی مدظلہ، ان لوگوں میں سے ہیں جو مسلمانوں کی سچی ہمدردی اور خیر خواہی رکھتے ہیں مسلمانوں کی بدحالی پر تڑپتے اور کڑھتے ہیں۔ اور ہر موقع پر اُن کو بنیادی خرابیوں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اور کیوں ایسا نہ ہو جب کہ حضرت صوفی صاحب شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے شرف تلمذ اور بیعت رکھتے ہیں۔ یقیناً یہ انہی کی بابرکت صحبت کا اثر ہے۔ اسی وجہ سے ان پورے دروس میں جابجا مسلمانوں کی تباہ حالی کا ذکر اور اُن کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی خوب واضح طور پر ملے گی۔ اِن دروس کی تمام جلدوں میں مستند تفاسیر کے اہم مسائل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جس سے عہد حاضر کے گھمبیر مسائل کا صحیح اور بہترین حل مل جاتا ہے۔ علمائے اہل حق کے عقائد کی روشنی میں غلط افکار اور باطل مذاہب کی مکمل بیخ کنی کی گئی ہے ان تمام دروس میں فلسفہ ولی اللّٰہی کے متفرق کتابوں میں بکھرے ہوئے گراں قدر جواہرات آسان اور عام فہم الفاظ میں بکثرت ملیں گے۔ ان دروس پر حکمت ولی اللّٰہی کی گہری چھاپ کافی نمایاں ہے

زیر نظر کتاب سورۃ فاتحہ کے انیس دروس پر مشتمل ہے۔ جس میں دس دروس ابتدائی اور اہم باتوں پر مشتمل ہیں۔ منجملہ ان کے تعوذ، تسمیہ کی تفسیر اور ان کے مسائل، مسائل تلاوت، فضائل قرآن، اصول تفسیر، فاتحہ خلف الامام اور آمین جیسے اہم مضامین شامل ہیں۔ ان دروس میں قرآن پاک اور تفاسیر کا مطالعہ کرنے والے حضرات کو قرآن کے مطالعہ کے لیے ضروری اور اکثر مطلوبہ باتیں مل جائیں گی۔ باقی نو دروس میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر اور اس کے ضمن میں بہت سے ضروری مسائل آگئے ہیں۔ ان میں توحید باری تعالیٰ، رسالت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، عظمت صحابہ کرامؓ اور مذاہب باطلہ کا ردّ بھی بہت اچھے انداز میں موجود ہے۔

راقم الحروف نے اس جلد میں ناظرین کرام کی سہولت کے لیے اکثر و بیشتر مقامات پر

حوالجات لگا دیئے ہیں تاکہ بوقت ضرورت اصل کُتب کی طرف مراجعت ہو سکے ۔

آخر میں دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب مدظلہ انجمنِ محبانِ اشاعتِ قرآن کے جملہ ارکین و معاونین ، فاضل مرتب جناب حاجی لعل دین ، سرگرم ارکان ، بلال احمد ناگی ، الحاج بابو غلام حیدر ، مستری محمد منیر ، شیخ محمد یعقوب ______ اور اسکی اشاعت میں حصہ لینے والے دیگر تمام حضرات کی فوز و فلاح اور بخشش کا ذریعہ بنائے اور ان کی سعی جمیل کو قبول فرمائے اور قیامت تک زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے ۔

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

فقط

محمد اشرف فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم و وفاق المدارس العربیہ پاکستان

۶ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۹۰ء

سُورَةُ الفَاتِحَة

سُورَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ سَبْعُ اٰیَاتٍ
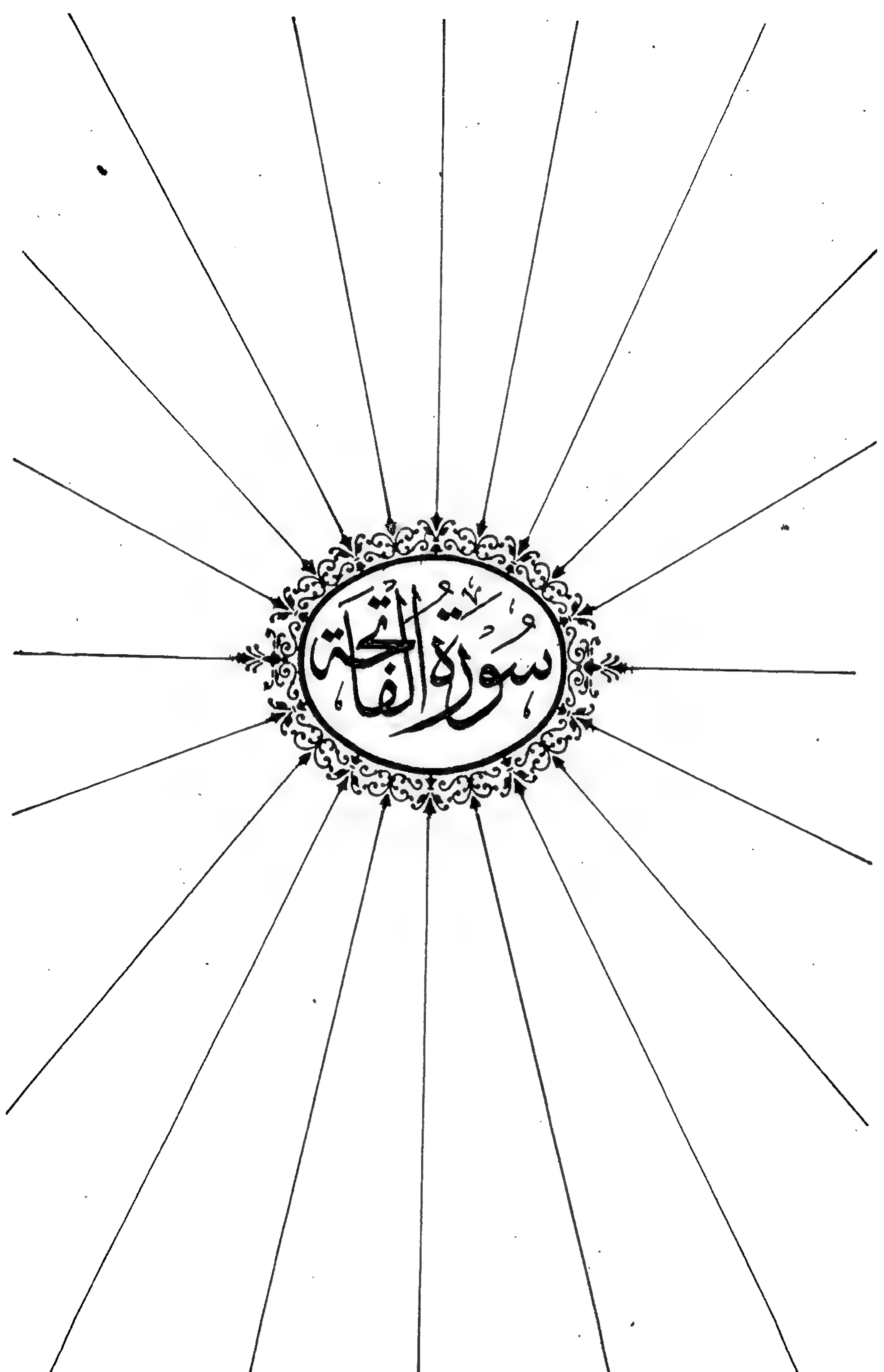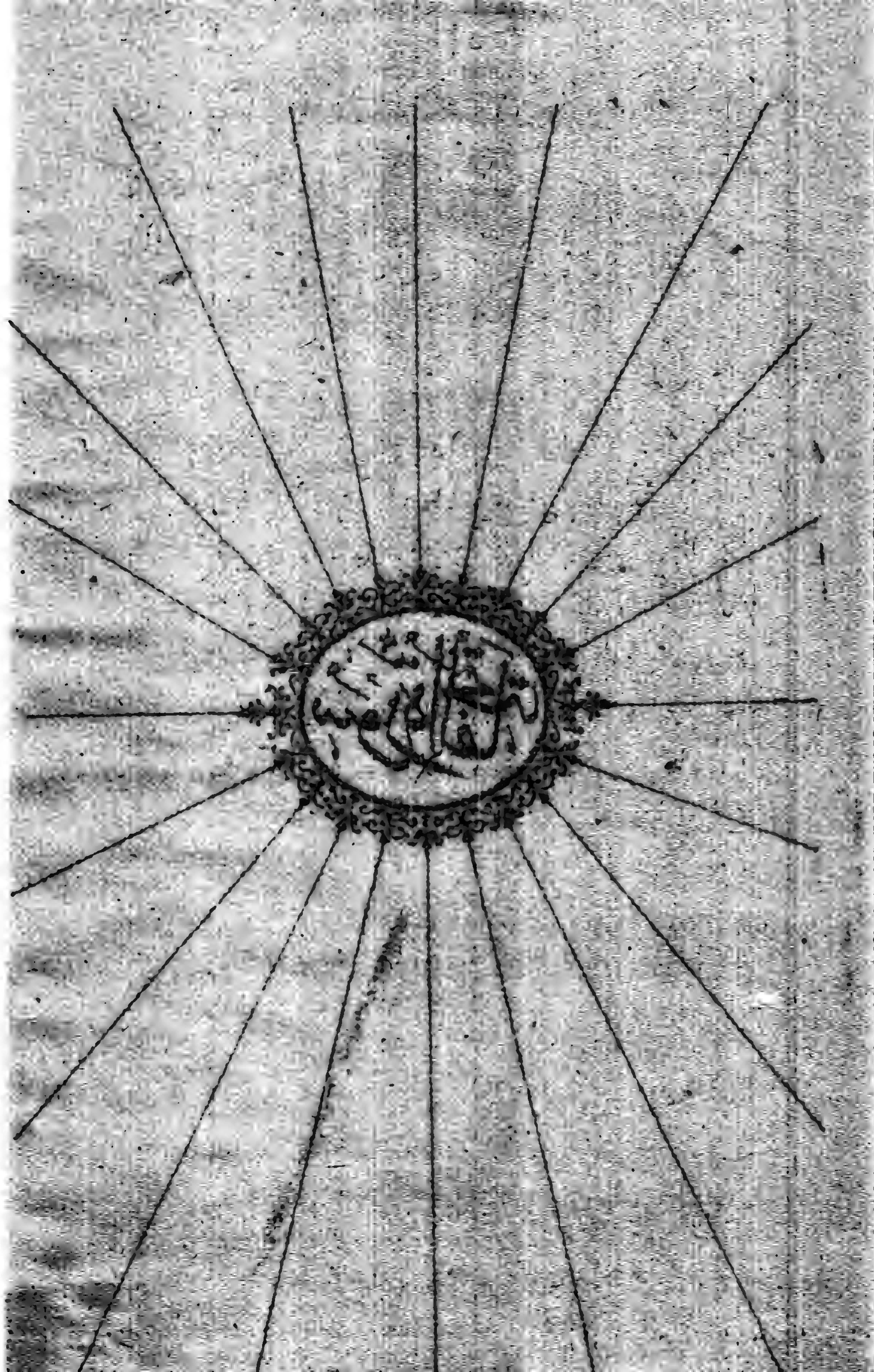
سورۃ فاتحہ مکّی ہے اور یہ سات آیات ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان اور رحم کرنیوالا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ② مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ③ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ④ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ⑥ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ⑦

ع ۱ ۷

ترجمہ:- سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو پرورش کرنے والا ہے سب جہانوں کا ① جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے ② جو مالک ہے انصاف (جزا) کے دن کا ③ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے

ہیں اور خاص تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں ④ اے پروردگار!
ہدایت کر ہم کو (دکھا ہم کو) سیدھا راستہ ⑤ اُن لوگوں کا
راستہ جن پر تو نے انعام کیا ⑥ اُن لوگوں کا راستہ نہ
دکھا جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ گمراہوں کا ⑦ آمین

عظمتِ قرآن

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (الاعراف) اگر نزولِ قرآن کے بعد لوگ اِس پر ایمان نہیں لائیں گے تو پھر اِس کے بعد کونسی چیز آئیگی جس پر وہ ایمان لائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جسے اُس نے انسانیت کی فلاح اور کائنات کی بہتری کے لیے نازل فرمایا ہے۔ یہ کتاب اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل ہوئی ہے اَب نہ کوئی نیا نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی شریعت نازل ہوگی۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نوشتہ یا صحیفہ نازل نہیں ہوگا، لہٰذا تمام انسانیت کا فرض ہے کہ وہ اس آخری کتاب پہ ایمان لے آئیں کہ اسی میں اُن کی فلاح ہے۔

قرآن پاک میں اللہ کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ قیامت کے دن جب محاسبے کی منزل آئیگی تو اللہ کا رسول اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کریگا وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (الفرقان) رسول عرض کریگا، اے پروردگار! میری اس قوم نے قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا یعنی نظر انداز کر دیا۔ نظر انداز کرنے سے مراد یہ ہے کہ کافر لوگ تو اس پر ایمان نہیں لاتے مگر جو لوگ زبانی تسلیم بھی کرتے ہیں وہ لاپرواہی سے کام لیتے ہیں، اس کی تعلیمات کو قبول نہیں کرتے

اور نہ اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔

جہادِ کبیر

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی قرآنِ کریم میں موجود ہے فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان) اے پیغمبر! آپ کافروں کی بات نہ مانیں اور ان کے خلاف اس قرآن کے ذریعے بڑا جہاد کریں گویا جہاد بالسیف کو جہادِ صغیر فرمایا اور قرآن کے ذریعے دنیا میں انقلاب برپا کرنے کو جہادِ کبیر کہا گیا ہے، قرآنِ پاک تمام باطل ادیان و مذاہب، تمام باطل رسومات کفر، شرک اور الحاد کے خلاف تعلیم دیتا ہے اللہ کی یہ آخری کتاب صرف اُسی چیز کی تعلیم دیتی ہے جو اللہ کے نزدیک برحق ہے، لہٰذا اس کی تعلیمات کو دنیا میں عام کرنا بہت بڑا جہاد ہے۔ جہاد بالسیف تو کسی نہ کسی وقت پر ختم ہو کر امن کی حالت قائم ہو جاتی ہے مگر جہاد بالقرآن ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں[1] کہ قرآن میں سزا کی وعید سے متعلق جتنی آیات موجود ہیں اُن کا شانِ نزول یہ ہے کہ دنیا میں جب تک برائی موجود ہے، یہ آیات اُس کو وعید سناتی رہیں گی، اسی طرح اس کتاب میں بشارت والی تمام آیات دنیا میں پائی جانے والی ہر نیکی کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات کی شانِ نزول کے لیے کوئی لمبے چوڑے قصے کہانیوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر برائی کے لیے وعید والی آیت نازل ہوئی ہے اور ہر نیکی کے کام کے لیے بشارت والی آیت اللہ نے نازل فرمائی ہے۔

---

[1] الفوز الکبیر فارسی صفحہ ۳ باب اوّل مطبع مجتبائی دہلی

اَب جن برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان میں اعتقادی عملی، اخلاقی، انفرادی اور اجتماعی ہر قسم کی برائیاں شامل ہیں۔ قرآنِ پاک اِن تمام برائیوں کی مذمت کرتا ہے اور اپنے نبی کو ان کے خلاف جہادِ کبیر کا حکم دیتا ہے۔ لوگوں کو برائی سے ہٹا کر نیکی کی طرف لے آنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کے لیے بڑی محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جوامع الکلم والی حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان[1] موجود ہے اَلْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ یعنی قرآنِ پاک تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف دلیل بنے گا، اگر تم قرآن پہ ایمان لے آئے، اسے اپنا لیا اور اس کے احکام پر عمل کیا، تو یہ تمہارے حق میں دلیل بنے گا اور تمہارے حق میں گواہی دے گا اور اگر اس کو قبول نہ کیا، اس میں کوتاہی کی یا عملی طور پر اسے پس پشت ڈال دیا تو یہی قرآنِ پاک تمہارے خلاف گواہی دے گا۔

قرآن بطور بہارِ دل

قرآنِ حکیم کی حیثیت اور عظمت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دُعا سے واضح ہوتی ہے جس میں آپ نے اس صحیفہ آسمانی کو آنکھوں کا نور اور دِل کا سرور فرمایا ہے[2] اَللّٰهُمَّ أَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَلَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ وَأَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ أَوِاسْتَاثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ بَصَرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذِهَابَ هَمِّيْ اے اللہ! میں تجھ سے تیرے ہر اُس اسمِ پاک کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے یا اُس کو کسی کتاب میں نازل فرمایا ہے، یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے، یا اُسے اپنے ہی پاس

---

[1] مسلم ج۱ ص۱۱۸ کتاب الطہارت [2] مسند احمد ج۱ ص۳۹۱ و ج۱ ص۴۵۲

رکھا ہے یا تیرے علم میں ہے، میں ہر اس اسم کے واسطے سے درخواست کرتا ہوں کہ قرآن پاک کو میرے دل کی بہار بنا دے یعنی جس طرح موسم بہار کے سبزہ، پھول اور پھلوں کو دیکھ کر لوگوں کے دل مسرور ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس قرآن پاک کو میرے دِل کی بہار بنا دے کہ یہ اُسے دیکھ کر باغ باغ ہو جائے۔ پھر عرض کیا، اِس قرآن کو میری آنکھوں کا نور بنا دے۔ اس کے ذریعے میرے غم اور اندیشوں کو دُور فرما دے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآنِ پاک کے ساتھ اس قدر محبت تھی اور آپ کے دِل میں اتنی عظمت تھی کہ آپ اس کیلئے دُعا فرمایا کرتے تھے۔

قرآن بطور معجزہ

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[1] ہے کہ ہر نبی کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا گیا مگر اکثر انبیاء کے معجزات وقتی طور پہ ظاہر ہوئے، لوگوں نے دیکھ لیا تو ختم ہو گئے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے جو خصوصی معجزہ عطا فرمایا وحیٌ اَوحَی اللّٰہُ اِلَیَّ یہ قرآن پاک ہے جو بذریعہ وحی مجھ پہ نازل کیا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اُمید ہے کہ قیامت کے دِن میرے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے کیونکہ میرا معجزہ بھی دائمی ہے۔ حضور علیہ السلام خود تو تریسٹھ سالہ زندگی گزار کر اس دُنیا سے رخصت ہو گئے مگر آپ پہ نازل ہونے والا قرآن بطور معجزہ تاقیامِ قیامت موجود رہے گا، اللہ کا یہ کلام حرف بحرف قائم و دائم رہیگا جس طرح حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے پڑھ کر سنایا چنانچہ سلیم الفطرت لوگ اس قرآن پاک کو پڑھ کر ایمان کی دولت سے مالامال ہو جاتے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم ابتداء سے انتہا تک وحی الٰہی اور حضور علیہ السلام کا زندہ

---

[1] بخاری صفحہ ۷۴۴ ج ۲ ۱۰۸۰ ج ۲ ۔ مسلم صفحہ ۸۶ ج ۱

معجزہ ہے۔ سورۃ جن میں موجود ہے کہ جب جنوں نے اس کلامِ الٰہی کو سُنا تو پُکار اٹھے اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا (الجن) ہم نے عجیب قرآن سُنا فَاٰمَنَّا بِہٖ پس اس پر ایمان لے آئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک عجیب اسلئے ہے کہ عام کُتب میں تو معلومات ہوتی ہیں مگر قرآن پاک میں معلومات کے علاوہ بے شمار ایسے معارف بھی موجود ہیں جنہیں لوگ ابدالآباد تک تلاش کر کے اپنے علم میں اضافہ کرتے رہیں گے مگر معارف ختم نہیں ہوں گے، کیونکہ وہ غیر محدود ہیں۔

قرآن ذکرِ الٰہی ہے

ذکر ایک بہترین عبادت ہے جسکی کوئی تحدید LIMITATION نہیں۔ ہر عبادت کی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے مگر ذکرِ الٰہی غیر محدود ہے۔ قرآن کریم کی ایک حیثیت ذکرِ الٰہی کی بھی ہے۔ سورۃ جمعہ میں آتا ہے وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی ہے[1] لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطۡبًا مِّنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ کسی شخص نے عرض کیا، حضور! کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیں جس کو ہمیشہ پڑھتا رہوں، آپ نے فرمایا کہ تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیئے۔ زبانی ذکر سب سے آسان ذکر ہے، خالی اللہ اللہ کرتا رہے یا سبحان اللہ کہتا رہے۔ یا رحمان یا رحیم کا ورد ہو یا یَاحَیُّ یَاقَیُّوۡمُ پڑھتا رہے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ، اَللّٰہُ اَکۡبَرُ، اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں۔

قرآن حکیم کی حیثیت علم کی بھی ہے اور ذکر کی بھی۔ چنانچہ قرآن پاک کی تلاوت افضل اذکار میں سے ہے۔ سوائے اُن اذکار کے جن کے متعلق حضور علیہ السلام نے خاص طور پر آگاہ فرمایا ہے، قرآن کے برابر کوئی دوسرا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ

---

[1] ترمذی ص ۱۷۵ ج ۲ باب ماجا فی فضل الذکر

جزائے عمل کے وقت قرآنِ پاک کی تلاوت کرنے والوں کو دیگر اذکار کی نسبت زیادہ اجر و ثواب حاصل ہوگا۔ بہر حال قرآنِ پاک ذکر بھی ہے۔

تلاوت قرآن کا اجر

بیہقی شریف[1] اور دیگر کتب میں یہ حدیث موجود ہے کہ سب سے زیادہ افضل قرآن پاک کی وہ تلاوت ہے جو نماز کے دوران کی جائے۔ نماز کے علاوہ ویسے قرآن پاک کی تلاوت تسبیح و تحمید سے افضل ہے یعنی ایک شخص سبحان اللہ، الحمد للہ اللہ اکبر وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اور دوسرا قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے تو تلاوت کرنے والا افضل ہے فرمایا تسبیح و تحمید صدقے سے زیادہ افضل ہے اور صدقہ روزے سے افضل ہے کیونکہ روزہ کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے جب کہ صدقہ اجتماعی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اس میں اللہ کی رضا بھی ہوتی ہے اور محتاج کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ آپ نے روزے کے متعلق فرمایا[2] اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ يَسْتَجِنُّ بِهَا الْعَبْدُ مِنَ النَّارِ خالص اللہ کی رضا کے لیے رکھا جانے والا روزہ دوزخ کے سامنے ڈھال بن جائیگا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ مذکورہ تمام امور میں تلاوت قرآن پاک کو اول درجے کی حیثیت حاصل ہے آدابِ قرآن کے سلسلہ میں حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان[3] ہے يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ یعنی اے قرآن پاک کے ماننے والو! قرآن کو سرہانے کے نیچے نہ رکھا کرو۔ اس کو پس پشت نہ ڈالو بلکہ وَاتْلُوْهُ اس کو پڑھو پڑھاؤ وَافْشُوْهُ اور اس کو پھیلاؤ۔ نیز فرمایا اس کے ثواب میں

---

[1] فیض القدیر شرح جامع صغیر ص ۵۱۳ ج ۴ بحوالہ بیہقی شعب الایمان

[2] نسائی ص ۳۱۱ ج ۱، بخاری ص ۲۵۴ ج ۱ و فیض القدیر شرح جامع صغیر ص ۲۴۲ ج ۴ بحوالہ طبرانی کبیر

[3] مشکوۃ ص ۱۹۲ کتاب فضائل القرآن بحوالہ بیہقی شعب الایمان

جلد بازی نہ کرو، اس کا ثواب یقیناً ملے گا، مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک فلاح کا پروگرام ہے تمام لوگوں کو چاہیئے کہ اس پر اعتقاد قائم کریں، اس کو پڑھیں، اس کو سمجھیں اور پھر اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔

قرآنِ حکیم کے متعلق تمہیدی طور پر چند کلمات میں نے عرض کر دیے ہیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ اعوذ باللہ کے متعلق تھوڑا عرض کریں گے، پھر بسم اللہ کا بیان ہوگا، اور پھر سورۃ فاتحہ کے متعلق تھوڑا تھوڑا بیان ہوگا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

میں پناہ حاصل کرتا ہوں اللہ تعالےٰ کی شیطان مردود سے

تعوذ بطور ذکر

ارشادِ خداوندی ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (النحل) جب آپ قرآنِ پاک پڑھیں تو پہلے اللہ کی ذات کے ساتھ شیطان مردود سے پناہ مانگیں۔ تعوذ کا معنیٰ پناہ طلب کرنا ہے قرآن وسنت میں مختلف شرور اور فتنوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے چنانچہ قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے۔

تعوذ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی ایک قسم ہے۔ سب سے آسان ذکر لسانی یعنی زبانی ذکر ہے۔ اس کی کل دس اقسام ہیں، جن میں سے تعوذ بھی ایک قسم ہے ذکر الٰہی کی قرآن وسنت میں بڑی فضیلت آئی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ) تم میرا ذکر کرو، مَیں تمہیں یاد کرونگا حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک[۱] ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے اِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ جو مجھے اپنے جی میں یاد کریگا میں بھی اسکو اپنے جی میں یاد کرونگا وَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَاٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَاٍ هُمْ خَيْرٌ مِّنْهُمْ جو آدمی مجھے کسی مجلس یا گروہ میں یاد کریگا تو میں اُس کا ذکر اُن سے بہتر گروہ میں کرونگا ذکر قلبی بھی ہوتا ہے اور لسانی بھی۔ تاہم لسانی ذکر آسان ہے۔ امام ابُو بکر جصاص فرماتے ہیں[۲] کہ قلبی یا نفسی ذکر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے قلب

---

۱ مسلم ص ۳۴۱ ج ۲ باب الذکر ۲ احکام القرآن الجصاص ص ۹۳ ج ۱

اور ذہن سے اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرے اور پھر اُس کا شکر ادا کرے یہ قلبی ذکر کا علمی انداز ہے، البتہ اصحابِ طریقت لوگوں کا معمول یہ ہے کہ وہ اندر جانے والے اور باہر آنے والے ہر سانس کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا ذکر کرتے ہیں اُن کا قلب خدا کا ذکر کرتا ہے مگر یہ چیز بڑی تربیت اور مشق کے بعد حاصل ہوتی ہے چونکہ لسانی ذکر ہی آسان تر ہے اس لیے عام لوگوں کو اسی ذکر کی تلقین کی جاتی ہے

اقسامِ ذکر
۱۔ تسبیح

لسانی ذِکر کی دس اقسام بیان کی جاتی ہیں جن میں پہلی قسم تسبیح ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بلند ترین ذکر ہے۔ سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا اے ایمان والو! اللہ کا خوب ذکر کرو اور اُس کی تسبیح بیان کرو صبح بھی اور شام کے وقت بھی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ہر چیز خدا تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے مگر تم اُن کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے، وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ غرضیکہ شجر و حجر اور کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ رب العزت کی تسبیح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور اور فہم و فراست عطا کر کے اُسے قانونِ الٰہی کا پابند (مکلف) بنایا ہے، لہذا اس پر بطریقِ اولیٰ لازم ہے کہ نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی تسبیح بیان کرے اپنی زبان سے سُبْحَانَ اللّٰهِ کہے۔ یعنی اے پروردگار تو ہر ساجھی، شریک، عیب، نقص، کمزوری اور ضعف سے پاک اور منزہ ہے

۲۔ تحمید

ذکر کی دوسری قسم تحمید ہے یعنی بندہ اپنے رب تعالیٰ کی تعریف بیان کرے اور کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تمام تعریفوں کا مستحق صرف خدا تعالیٰ ہے کیونکہ تمام داخلی اور خارجی انعامات کو وجود دینے والا وہی ہے۔ تحمید نماز میں بھی کی جاتی ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ چنانچہ نماز میں تسبیح کے بعد تحمید انہی الفاظ سے کی جاتی ہے۔ پھر جب ایک رکعت کی قرأت مکمل ہو جاتی ہے تو رکوع سے اٹھ کر کہتے ہیں رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ اے پروردگار! تعریف تیرے ہی لیے ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنا بلند ترین اذکار میں سے ہے

۳۔ تکبیر

تکبیر بھی ذکر ہے جس کے ذریعے اللہ کی بڑائی اور عظمت کا اظہار کیا جاتا ہے جب کوئی اہم کام انجام دیا جائے تو اپنے ضعف کے پیش نظر زبان سے کہتے ہیں اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللہ بڑا ہے۔ اس کے سوا کسی کے لیے بڑائی نہیں ہے۔ سورۃ مدثر میں ارشاد ہے وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو، چنانچہ نماز کی ابتدا ہی اس لفظ سے ہوتی ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور پھر نماز میں ایک حرکت سے دوسری حرکت کی طرف جاتے ہوئے اس لفظ کو دہرایا جاتا ہے اور اس طرح اللہ رب العزت کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔

۴۔ تہلیل

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بھی ذکر ہے۔ اس کے ذریعے شرک کی نفی او رخدا تعالیٰ کی الوہیت کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُس کے سوا کوئی خالق، مالک اور مربّی نہیں۔ وہ ذات وحدہٗ لاشریک ہے۔ تہلیل کے ساتھ توحید کا کلمہ بھی آتا ہے وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وہ اکیلا ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ بھی ذکر کی ایک قسم ہے۔

۵۔ حوقلہ

حوقلہ یعنی لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ بھی ذکر کی ایک قسم ہے یہ تفویض اور توحید کا کلمہ ہے اور حضور علیہ السلام کے ارشاد[1] کے مطابق عرش الٰہی کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ اس کے ذریعے انسان خدا تعالیٰ کے سامنے اقرار کرتا

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۳۴۶

ہے کہ برائیوں سے باز رہنے اور نیکی کو انجام دینے کا عمل محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ اس کلمے کا ورد کرنے سے بہت بڑا اجر حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ حسبلہ

ذکر کی ایک قسم حسبلہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے مفرد کلمہ حسبی اللہ اور جمع کا کلمہ حَسْبُنَا اللّٰہُ آتا ہے۔ ہر مشکل وقت میں اس کلمہ کا ورد خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے۔ اُحد کے موقع پر جب صحابہؓ کو سخت دشواری پیش آئی تو انہوں نے یہی کہا تھا قَالُوا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (آل عمران آیت ۱۷۳) ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر لوگ آپ کی بات کا انکار کرتے ہیں فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (توبہ) تو آپ کہہ دیں کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ وہی معبود برحق اور میرا اُسی پر بھروسہ ہے۔

۷۔ بسملہ

بسملہ بھی ذکر ہی کی ایک قسم ہے۔ ہم ہر کار خیر کی ابتداء بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کرتے ہیں۔ سورۃ مزمل میں ارشاد ہے وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ یعنی اپنے رب کا ذکر کرو۔ غار حرا میں سب سے پہلی وحی کا نزول بھی اسی طرح ہوا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ آپ اُس پروردگار کا نام لے کر پڑھیں جس نے پیدا کیا، چنانچہ ہر اچھا کام کرتے وقت بسم اللہ کہنا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اُس کی بڑی فضیلت ہے

۸۔ استعانت

استعانت یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا بھی ذکر میں شامل ہے۔ ہم ہر نماز میں کہتے ہیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد کے طالب ہیں۔ مافوق الاسباب اعانت خدا تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا ھُوَ الْمُسْتَعَانُ مدد کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، لہٰذا مدد اُسی سے طلب کی جا سکتی ہے۔

۹۔تبارک

اللہ کا ذکر لفظ تبارک کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے جیسے فرمایا تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ (ملک) بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے نیز یہ بھی فرمایا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المؤمنون) بڑی برکتوں والی ہے وہ ذات جو بہترین تخلیق کرنیوالی ہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ اللہ کی ذات بڑی بابرکت ہے جس نے قرآن جیسی عظیم کتاب اپنے بندے پر نازل فرمائی۔ تاکہ اس کے ذریعے وہ تمام انسانوں کو خبردار کردے۔ برکت کا معنی ایسی زیادتی ہوتا ہے جس میں تقدس کا معنی پایا جائے۔ چنانچہ جب بھی کوئی اچھی چیز دیکھی جائے تو کہنا چاہئیے بَارَكَ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے۔ یہ ذکر ہے، عرب اسے محاورے کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔

۱۰۔تعوذ

ذکر کی دسویں قسم تعوذ یعنی اعوذ باللہ کہنا ہے۔ اس کے لیے قرآن و سنت میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب قرآن پڑھو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طرح کرو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ چنانچہ آج تعوذ کے بارے میں کچھ عرض ہوگا۔

تعوذ کی ضرورت

اس دُنیا میں انسان کوئی بھی کام کرنا چاہے خواہ وہ نیکی کا ہو یا بُرائی کا، توفیق ایزدی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعوٰی نہیں کرسکتا کہ وہ کوئی کام از خود انجام دے سکتا ہے مگر یہ کہ ہر قدم پر نصرت خداوندی کی ضرورت ہوگی۔ خاص طور پر جب کوئی آدمی نیک کام انجام دینا چاہتا ہے تو اُس کو طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں تاکہ یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ طرح طرح کے شرور اور فتنے راستے میں حائل ہوتے ہیں، اسی لیے انسان کو تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی بھی اچھائی کا کام شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرلے، انسان کے حق میں

علم اور عمل دو مفید ترین چیزیں ہیں اور ہر انسان اِن دونوں چیزوں کا محتاج ہے۔
علم میں عقیدہ بھی شامل ہے اور ظاہر ہے کہ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا عقیدہ اور فکر پاک ہو مگر تمام انسان اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے کیونکہ ہر انسان اپنی قوت کے بھروسے پر یہ چیز حاصل نہیں کر سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شاملِ حال نہ ہو۔ عمل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ کوئی بھی اچھا عمل اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی اعانت و نصرت کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

حواس ظاہرہ و باطنہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں بہت سے حواسِ ظاہرہ اور باطنہ ودیعت فرمائے ہیں۔ حواس ظاہرہ میں قوتِ باصرہ (دیکھنے کی طاقت) قوتِ سامعہ (سننے کی طاقت)، قوتِ ذائقہ (چکھنے کی طاقت) قوتِ لامسہ (ٹٹولنے کی طاقت) اور قوتِ شامہ (سونگھنے کی طاقت) شامل ہیں۔ اِسی طرح حواسِ باطنہ میں وہم، خیال، حسِ مشترک، قوتِ متفکرہ، ذہانت اور قوتِ عاقلہ ہیں جو اللہ تعالےٰ نے انسان کے دماغ میں رکھی ہیں۔ اِن ظاہری اور باطنی حواس کے علاوہ انسان میں شہوت اور غضب کا مادہ بھی ہے۔ قوتِ جاذبہ جس کے ذریعے انسانی جسم غذا کو جذب کرتا ہے۔ قوتِ ہاضمہ ہے جس کے ذریعے کھائی جانے والی خوراک ہضم ہوتی ہے۔ یہ عمل معدے، آنتوں اور جگر میں انجام پاتا ہے۔ پھر قوتِ غاذیہ ہے جو غذا کو ٹھکانے پر پہنچاتی ہے۔ قوت دافعہ فضلات کو جسم سے باہر نکالتی ہے اگر یہ چیزیں اندر رُک جائیں تو صحت بگڑ جائیگی۔ انسانی جسم میں قوتِ نامیہ بھی ہے جس کے ذریعے انسانی جسم کی ایک خاص حد تک نشو و نما ہوتی ہے۔ ایک قوت مُولدہ بھی ہے جو تولیدی مادہ کے ذریعے نسلِ انسانی کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔

شیطان سے پناہ طلبیدا

اِن تمام قویٰ کا رُخ عام طور پر نفس کی طرف ہوتا ہے اور نفس کا رُخ شر کی طرف، سورۃ یوسف میں موجود ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف) نفس انسان کو اکثر برائی کی طرف مائل کرتا ہے مثلاً آنکھ کا کام دیکھنا ہے، مگر اچھی اور جائز چیز دیکھنے کی بجائے نفس اسے ناجائز اور حرام چیز دیکھنے پر آمادہ کریگا۔ اسی طرح جب انسان کوئی عبادت یا دیگر نیک کام انجام دینا چاہتا ہے اور اپنے اُوپر بعض پابندیاں عائد کرتا ہے تو آزادی پسند نفس نہ تو ایسی پابندیوں کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی مشقت برداشت کرنا پسند کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر نفس اور بیرونی طور پر شیطان اُس نیک کام کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن اندرونی اور بیرونی شرور سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کام شروع کرنے سے پہلے خدا تعالیٰ کی پناہ میں چلا جائے اور یہ پناہ تعوذ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کہتا ہے تو اس کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے میرے شدید دشمن شیطان سے پناہ میں رکھے تاکہ میں عبادت، تلاوت یا دیگر نیکی کا کام انجام دے سکوں۔

شیطان شطن کے مادے سے مشتق ہے اور اس کے دو معانی آتے ہیں اس کا ایک معنیٰ دُوری ہے، گویا شیطان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُور ہے اسی لیے اس کو رجیم یا مردود اور لعین بھی کہا جاتا ہے۔ شطن کا دوسرا معنیٰ ہلاکت ہے، اور یہ بھی شیطان پہ صادق آتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے غرور و تکبر کی وجہ سے بالآخر ہلاک ہونے والا ہے چونکہ شیطان ہر اچھے کام میں دخیل ہوتا ہے، اس لیے اُس کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرنا ضروری ہے

تعوذ کی تعلیم

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سب سے پہلی وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی اور

جبرائیل علیہ السلام نے سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات آپؐ کو پڑھائیں[1] اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ⑤

مفسرِ قرآن امام ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے[2] اَوَّلُ مَا نَزَلَ جِبْرِیْلُ عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا مُحَمَّدُ اسْتَعِذْ ثُمَّ قَالَ قُلْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یعنی پہلی آیات کے نزول سے متصلاً اسی دن جبرائیل علیہ السلام حضور علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا، اے محمد! اللہ تعالیٰ سے پناہ حاصل کریں اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بھی پڑھا دیا گیا۔ پھر آپ کو سورۂ فاتحہ کی تعلیم دی گئی اور وضو کا طریقہ تبلایا گیا اور پھر آپ کو نماز کے لیے کھڑا ہونے کا حکم ہوا۔ چنانچہ روایات[3] سے ثابت ہے کہ وحی کے دوسرے دن حضور علیہ السلام نے نماز باجماعت ادا کی۔ آپ کے پیچھے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت خدیجہؓ تھیں بعض روایات میں حضرت زیدؓ کا ذکر بھی ملتا ہے۔

شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ قرأت کے علاوہ باقی عبادات شروع کرتے وقت صرف بسم اللہ پڑھنا چاہیے جبکہ قرأت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا ضروری ہے۔ امام جعفر صادقؒ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں[4] کہ انسان کی زبان جھوٹ، غیبت اور غلط باتوں سے اکثر ناپاک رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاک

---

[1] بخاری ص ۳۹۷ ج ۲، مسلم ص ۸۸ ج ۱ [2] تفسیر ابن جریر طبری ص ۵۰ ج ۱

[3] [4]

کلام کی تلاوت سے قبل زبان کا پاک ہونا ضروری ہے، اس لیے تعوذ کی تعلیم دی گئی ہے۔

مسنونہ تعوذات

روایات میں تعوذ[1] کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ جیسے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ یا اَعُوْذُ[2] بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بعض روایات میں مِنَ الشَّیْطٰنِ اللَّعِیْنِ الرَّجِیْمِ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ اور نَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ بھی آتا ہے۔ حمید ابن قیسؒ کی روایت میں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْقَادِرِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الْغَادِرِ کے الفاظ بھی آتے ہیں یعنی میں اللہ کی پناہ حاصل کرتا ہوں جو قادر ہے شیطان سے بچنے کے لیے جو غدار ہے بعض محدثین نے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْقَوِیِّ مِنَ الشَّیْطٰنِ الْغَوِیِّ میں قوی اللہ کی پناہ میں آتا ہوں اُس شیطان سے جو خود گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو دم کرتے تو یہ الفاظ ادا فرماتے[3] اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمٰتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ وَّھَامَّۃٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّامَّۃٍ میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تامہ کی پناہ میں دیتا ہوں، ہر شیطان سے اور کیڑے سے اور ہر نظرِ بد لگانے والی آنکھ سے۔ حضور علیہ السلام جب کسی منزل پر اُترتے تو یوں[4] کہتے اَعُوْذُ بِکَلِمٰتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ کُلِّھَا مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص۱۴ ج۱، [2] ترمذی ص۵۷ ج۱ [3] عمل الیوم واللیلۃ مع ترجمہ نبوی لیل و نہار ۵۹۱

[4] مسلم ص۳۴۷ ج۱، عمل الیوم واللیلۃ نبوی لیل و نہار ص۳۴

میں اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ کے ساتھ ہر اُس بُرائی سے پناہ چاہتا ہوں جو خدا تعالےٰ نے پیدا کی ہے۔ آپ نیند سے بیدار ہونے پر یہ کلمات ادا فرماتے۔ اَعُوْذُ بِکَلِمٰتِ اللّٰہِ التَّآمَّاتِ مِنْ غَضَبِہٖ وَعِقَابِہٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیٰطِیْنِ میں اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ کے ساتھ اس کے غضب سے، عقاب سے، اُس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کی چھیڑ چھاڑ سے پناہ پکڑتا ہوں۔ حضور علیہ السّلام نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اس طرح استعاذہ فرماتے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ[1] میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں شیطان مردود کی چھیڑ چھاڑ سے اُس کے تکبر سے اور اس کے سحر سے۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا[2] کہ بیت الخلاء میں داخلے سے پہلے کہو اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ[2] اے اللہ میں نر اور مادہ شیاطین سے تیری ذات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔ فرمایا جو شخص یہ کلمات ادا نہیں کرتا، شیطان اُس کے اعضائے مستورہ کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی سکھلایا کہ بیت الخلاء سے باہر آکر کہو غُفْرَانَکَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میرے جسم سے اذیت ناک چیز نکال دی اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سفر پر جانے کی یہ دُعا سکھائی ہے[3] اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَعْثَآءِ السَّفَرِ وَکَآبَۃِ الْمُنْقَلَبِ وَمِنْ

---

[1] ترمذی ص ۵۷ ج ۱ ، [2] عمل الیوم واللیل نبوی لیل ونہار ص ۶۵ ، ترمذی ص ۲ ج ۱

[3] عمل الیوم واللیل نبوی لیل ونہار ص ۳۰۴ ، ترمذی ص ۱۸۲ ج ۲ کتاب الدعوات

الحَورِ بعدَ الکَورِ۔ اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ سفر کی مشقت سے، واپس پلٹ کر غمگین منظر دیکھنے اور ترقی کے بعد تنزل میں جانے سے پناہ مانگتا ہوں۔ جب کسی کو غم و اندیشہ لاحق ہو جائے تو نبی علیہ السلام نے اس طرح سکھایا[1] اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْکَسَلِ خداوند تعالیٰ! میں تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں غم سے اندیشے سے، عاجزی سے اور کم ہمتی سے۔ آپ نے اس طرح بھی استعاذہ فرمایا ہے[2] اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیۡ رُشْدِیۡ وَاَعِذْنِیۡ مِنْ شَرِّ نَفْسِیۡ اے اللہ! مجھے میری نیکی کی بابت الہام فرما اور مجھے میرے نفس کے شر سے بچا۔

حضور علیہ السلام سے یہ دعائیں بھی ثابت ہیں[3] اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَھَنَّمَ اے اللہ! جہنم کے عذاب سے تیری ذات کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں اَعُوۡذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ[4] میں قبر کے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں اَعُوۡذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ[5] وَمِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ میں تیری پناہ چاہتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے اور گناہ اور تاوان سے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رض کہتی ہیں کہ حضور علیہ السلام جب بھی نماز پڑھتے تو قبر کے عذاب اور فتنہ سے پناہ مانگتے اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ اور دوسروں کو بھی تلقین فرماتے۔ آپ نے ان الفاظ

---

[1] بخاری ص ۹۴۱ ج ۲ [2] ترمذی ص ۱۸۶ ج ۲ کتاب الدعوات۔
[3] بخاری ص ۹۴۳ ج ۲ و مسلم ص ۲۴۷ ج ۲ [4] سنن نسائی ص ۳۱۹ ج ۲
[5] سنن نسائی ص ۳۱۶ ج ۲

کے ساتھ بھی استعاذہ فرمایا اَللّٰھُمَّ[۱] اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ فِتْنَۃِ الْغِنٰی وَمِنْ شَرِّ فِتْنَۃِ الْفَقْرِ اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ دولتمندی اور فقر کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں. غنی اور فقر دونوں باعثِ آزمائش ہیں. بسا اوقات لوگ ان کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لہٰذا آپ نے ان فتنوں سے محفوظ رہنے کے لیے استعاذہ فرمایا. حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا میں پناہ چاہتا ہوں مِنْ شَرِّ مَا عَلِمْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْلَمْ اس چیز کے شر سے جس کو میں جانتا ہوں اور اس چیز کے شر سے بھی جس کو میں نہیں جانتا. آپ نے یہ بھی فرمایا[۲] مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ میں ہر اس عمل کے شر سے پناہ پکڑتا ہوں جس کو میں نے کیا ہے اور جس کو میں نے نہیں کیا. حضور علیہ السلام نے ہر قسم کے دشمن کے شرور سے اس طرح پناہ سکھلائی[۳] اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ اے اللہ ہم تجھے دشمنوں کے مقابلہ میں کرتے ہیں اور اُن کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں. آپ نے رات کو پیش آنے والے فتنوں سے بھی پناہ سکھائی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ طَوَارِقِ اللَّیْلِ میں رات کو آنے والے فتنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں.

قرآنی تعوذات

قرآنِ پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام نے بھی بعض مواقع پر تعوذ کیا. سورۃ بقرہ میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ موجود ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے

---

[۱] بخاری ص ۹۴۳ ج ۲، مسلم ص ۳۴۷ ج ۲ [۲] سنن نسائی ص ۳۲۰ ج ۲

[۳] عمل الیوم واللیلہ امام نسائی ص ۳۶۵

کا حکم دیتا ہے تو قوم نے کہا، کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ اُس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ میں اللہ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ فرمایا ٹھٹا کرنا جاہلوں کا کام ہے میں تو تمہیں اللہ کا کلام سُنا رہا ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب اُن کی لغزش پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تو کہنے لگے اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ (سورۃ ہود) اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ حضرت یُوسف علیہ السلام کے واقعہ کا مطالعہ کیجئے۔ جب عزیز مصر کی بیوی نے آپ کو بُرائی کی ترغیب دی تو آپ نے فرمایا مَعَاذَ اللّٰہِ اِنَّہٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط (سورۃ یوسف) پناہ بخدا، وہ تو میرا مربی ہے اُس نے مجھے عزت دی ہے، میں اس کے ناموس میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ پھر جب یُوسف علیہ السلام کے ایک بھائی کو چوری کے الزام میں روک لیا گیا تو بھائیوں نے کہا کہ اِس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو روک لو اور اِس کو چھوڑ دو۔ اس کے جواب میں بھی یُوسف علیہ السلام نے فرمایا مَعَاذَ اللّٰہِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَہٗٓ پناہ بخدا! ہم تو صرف اُسی شخص کو روکیں گے جس کے ہاں سے ہمارا سامان برآمد ہوا ہے

حضرت مریمؑ کے حجرہ میں تنہائی کے دوران ایک فرشتہ انسانی شکل میں پہنچ گیا۔ آپ گھبرا گئیں اور کہنے لگیں، اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا (سورۃ مریم) میں خدائے رحمان کی پناہ میں آتی ہوں تجھ سے

اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے۔ اور جب مریمؑ پیدا ہوئیں تو اُن کی والدہ نے اِن الفاظ کے ساتھ خدا تعالےٰ سے استعاذہ کیا اِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ (آل عمران) اے خدایا! مَیں اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں. جب فرعون اور اس کے ساتھیوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ہلاک کرنے کی دھمکی دی تو آپ نے کہا وَاِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَرَبِّكُمۡ اَنۡ تَرۡجُمُوۡنِ (الدخان) میں اپنے اور تمہارے رب سے اس بات کی پناہ پکڑتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کردو۔

سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ جب کبھی شیطان کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہو، تو اللہ کی پناہ طلب کرو بیشک وہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ قرآن پاک میں یہ حکم بھی موجود ہے قُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ ۙ وَاَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ خداوند کریم! میں تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں شیاطین کی چھیڑ چھاڑ سے اور اس بات سے بھی پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے نیک کام میں خلل اندازی کے لیے حاضر ہوں۔ قرآن پاک کی آخری دو سورتیں جن کا حال ہی میں درس ہوا ہے استعاذہ کے مضمون پر ہی ہیں۔ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ کہو کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں۔ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ غرضیکہ اِن دو سورتوں میں مختلف قِسم کی برائیوں سے پناہ پکڑنے کا طریقہ سکھلایا گیا ہے۔

قرآن و سنّت میں تعوذ کے مختلف الفاظ بیان ہوئے ہیں جن میں سے کچھ عرض کر دیے گئے ہیں۔ قرآن پاک ایک عظیم نعمت ہے، جب کوئی شخص اس سے استفادہ حاصل کرنا چاہے گا تو شیطان ضرور اس کے راستے میں رکاوٹ بنے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا چاہو تو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھ لیا کرو

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور رحم کرنیوالا ہے

ربطِ مضامین

کل تعوذ کے بارے میں تھوڑا سا بیان ہوا تھا۔ قرآن پاک کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ پڑھنا ضروری ہے اس کی تھوڑی سی حکمت بھی عرض کی تھی۔ مفسرین کرام فرماتے[1] ہیں کہ تعوذ میں اعتصام باللہ پایا جاتا ہے۔ جب کوئی اعوذ باللہ پڑھتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ چنگل مارتا ہے کہ خدا تعالیٰ اُسے تمام فتنوں اور خاص طور پر شیطان کے فتنہ سے اپنی پناہ میں لے لے۔ اب آج بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے متعلق مختصر گفتگو ہوگی۔

بسم اللہ سے ابتدا

مفسرین کرام فرماتے[2] ہیں کہ بسم اللہ میں دو چیزیں بطورِ خاص پائی جاتی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور دوسرا اس پر توکل۔ جب کوئی شخص کسی کارِ خیر کو شروع کرتے وقت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اپنے پروردگار اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھتا ہوں اور اُسی کے بھروسے پر یہ کام شروع کرتا ہوں۔

قدیم زمانہ سے لے کر آج تک کافر اور مشرک ہمیشہ اکثریت میں رہے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے والے اَقَلُّ مِنَ الۡقَلِیۡلِ یعنی قلیل تعداد میں رہے ہیں۔ آج بھی دنیا کی کل آبادی کا غالب حصہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۱۵ [2] ایضاً

کفار و مشرکین پر ہی مشتمل ہے مشرک لوگ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے اپنے معبودانِ باطلہ کا نام لیتے ہیں۔ پُرانے زمانے کے عرب کے مشرکین اپنے معبودان لات، منات اور عزیٰ وغیرہ کا نام لیتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے لوگ ود، سواع، نسر وغیرہ کا نام لے کر کام کی ابتداء کرتے تھے۔ عیسائی آج بھی باپ بیٹا اور روح القدس کا نام لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب دنیا میں اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اس کے ماننے والے اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کا نام لے کر شروع کیا کریں جو کہ معبود برحق اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو سب سے پہلی آیات نازل ہوئیں اُن کی ابتداء بھی اسی حکم کے ساتھ ہوئی[1] اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ اُس پروردگار کا نام لے کر پڑھیئے جس نے پیدا کیا۔ قرآن پاک میں اللہ کے اسم پاک کے ذکر کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ سورۃ مزمل میں فرمایا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ اپنے رب کے نام کا ذکر کرو۔ سورۃ اعلیٰ میں ہے وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی، اسی طرح سورۃ احزاب میں ہے اے ایمان والو! اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا اللہ تعالیٰ کا خوب ذکر کرو اور صبح شام اس کی تسبیح بیان کرو۔ بہرحال اہل ایمان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ ہر اچھے کام کی ابتداء بسم اللہ سے کریں۔

امام ابوبکر جصاصؒ[2] اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ہر اچھے کام کے شروع میں خواہ وہ کھانا پینا ہی ہو بسم اللہ پڑھنی چاہیئے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

---

[1] بخاری ص۲ ج۱، مسلم ص۸۸ ج۱، [2] احکام القرآن ص۷ ج۱

کا فرمان بھی ہے[1] كُلُّ امْرٍ ذِي بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ بِبِسْمِ اللهِ فَهُوَ اَقْطَعُ
ہر اچھا، جائز اور شان والا کام اگر بسم اللہ سے شروع نہیں کیا جائیگا تو وہ کام دُم
کٹے جانور کی طرح ہوگا یعنی بے برکت ہوگا۔ نبی کریم علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے
کہ جس خطبے کی ابتداء میں بسم اللہ نہ پڑھی جائے یعنی اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے
فَهُوَ اَجْزَمُ وہ جذامی آدمی کی طرح ہوتا ہے جس کی انگلیاں وغیرہ گل چکی ہوں
لہٰذا ہر جائز کام کی ابتداء میں بطور تعظیم اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔

بسم اللہ جزوِ قرآن یا سورۃ

سورۃ نمل کی آیت ۳۰ ہے اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللهِ
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ چنانچہ تمام محدثین اور فقہائے کرام کا اس بات پر
اتفاق ہے کہ قرآن پاک کی کم و بیش ۶۶۱۶ آیات میں سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ایک آیت ہے اور یہ جزوِ قرآن ہے۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے
کہ بسم اللہ ہر سورۃ کا جزو بھی ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے پیروکار
کہتے ہیں[2] کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کا جزو تو ہے مگر ہر سورۃ کا جزو نہیں۔
چنانچہ جب قرآنِ پاک بالجہر پڑھا جاتا ہے تو صرف سورۃ نمل میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
کی تلاوت بالجہر کی جاتی ہے، باقی پورے قرآن پاک میں بسم اللہ آہستہ پڑھی جاتی
ہے بجز ایک مرتبہ کے ہر دو سورتوں کے درمیان جو بسم اللہ لکھی جاتی ہے، یہ
محض سورتوں کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ ابتدائے سورۃ
میں بسم اللہ کسی سورۃ کا جزو نہیں ہے۔

چونکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن پاک کا جزو ہے۔ اس لیے اس کے
بھی وہی احکام ہیں جو قرآن پاک کے ہیں۔ کوئی جنبی آدمی یا حیض و نفاس والی عورت

---

[1] فیض القدیر شرح جامع صغیر صفحہ ۱۳/۵ [2] احکام القرآن صفحہ ۹/۱

قرآن پاک کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ) اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے[1] لَا تَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا وَاَنْتَ طَاهِرٌ یعنی طہارت کے بغیر قرآن پاک کو ہاتھ مت لگاؤ۔ چنانچہ قرآن پاک کی کوئی آیت خواہ وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی ہو اگر کسی علیحدہ کاغذ پر بھی لکھی ہوئی ہو تو شرعی ناپاکی کی حالت میں اُسے ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔ اسی طرح قرآن کا کوئی حصہ بشمول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جنبی آدمی یا حیض و نفاس والی عورت کے لیے پڑھنا بھی جائز نہیں البتہ ایک بات ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم چونکہ ذکر بھی ہے، اس لیے ناپاک آدمی بطور ذکر اس کو پڑھ سکتا ہے کیونکہ ذکر ہر حالت میں روا ہے۔ چنانچہ ناپاک مرد یا عورت کلمہ شریف استغفار، درود شریف، سبحان اللہ، الحمد للہ لا الٰہ الا اللہ اور بسم اللہ پڑھ سکتا ہے۔ البتہ ہاتھ لگانے کی ممانعت ہے۔

نماز میں بسم اللہ

نماز میں سورۃ فاتحہ سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا ضروری ہے۔ کیونکہ سورۃ فاتحہ قرآن کا حصہ ہے جس کے متعلق قطعی حکم ہے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (النحل) اور اس کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا سنت ہے۔ چنانچہ امام اعوذ باللہ اور بسم اللہ دونوں آہستہ پڑھیگا۔ اس سلسلے میں حضرت انسؓ کی روایت میں آتا ہے[2] کہ میں نے حضور علیہ السلام، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی مگر کسی نے بھی بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھی۔ اُونچی آواز سے قرأت الحمد للہ سے شروع کرتے تھے، تاہم بسم اللہ کا پڑھنا ضروری (سنت ہے) اس کے بعد جب سورۃ فاتحہ پڑھ کر دوسری سورۃ ملانے لگے تو دونوں سورتوں کے درمیان بھی بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے اور پڑھنے

---

[1] دارقطنی ص۱۲۲ ج۱ فیض القدیر شرح جامع صغیر ص۵۵ ج۶ بحوالہ ابو حاتم، دارقطنی، عبدالرزاق، بیہقی، طیالسی [2] مسلم ص۱۷۲ ج۱

والا ثواب کا مستحق ہوگا۔ البتہ اگر دو سورتوں کے درمیان بسم اللہ نہ بھی پڑھی جائے تو نماز میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ احناف اسی بات کا فتویٰ دیتے ہیں۔

بسم اللہ بوقت ذبح

جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنی فرض ہو جاتی ہے کیونکہ یہ ملّت کا شعار ہے۔ اگر اس موقع پر اللہ کا نام نہیں لے گا بسم اللہ اللہ اکبر نہیں کہے گا۔ تو شعار کے خلاف ہوگا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا حکم بھی موجود ہے فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (الحج) اونٹوں کی قطاروں کو اللہ کا نام لے کر نحر کرو۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان بھی موجود ہے وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (الانعام) جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس کو مت کھاؤ، وہ مردار کی مانند ہے البتہ اگر کوئی شخص بوقت ذبح بسم اللہ اللہ اکبر کہنا بھول جائے تو اُس کے لیے معافی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا فرمان[1] ہے کہ اللہ کا نام ہر مومن کے دل میں ہوتا ہے۔ اور اگر قصداً اللہ کا نام نہیں لیا تو ذبیحہ حرام ہوگا کہ یہ ملّت ابراہیمیہ کے اصولوں کے خلاف ہے۔

ہر کام میں بسم اللہ

کوئی بھی کام ہو طہارت، کھانا پینا، لباس پہننا، چلنا، سونا، تمام کام اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے شروع کرنے چاہئیں حضور علیہ السلام کا ارشاد[2] ہے کہ جب گھر سے نکلو تو کہو بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ میں اللہ کا نام لے کر اللہ ہی کے بھروسے پر چلا ہوں آپ نے گھر میں داخل ہونے کی دعا اس طرح سکھائی ہے[3] اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلِجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا اے اللہ! میں گھر میں خیریت

---

[1]

[2] عمل الیوم واللیلۃ للنسائی ص۱۷۱، رقم الحدیث ۸۶ ترمذی ص۴۹۴؟ ، [3] ابوداؤد ص ۳۳۹/۲

سے داخل ہونے اور خیریت سے نکلنے کا سوال کرتا ہوں۔ ہم اللہ کے نام کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے پروردگار اللہ پر ہمارا بھروسہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب بسم اللہ کہا جاتا ہے تو اس میں فعل محذوف ہوتا ہے۔ آدمی فعل کی مناسبت سے بسم اللہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے میں کھاتا پیتا ہوں یا پہنتا ہوں یا سواری پر بیٹھتا ہوں یا کوئی دیگر کام کرتا ہوں۔ حضرت ام سلمہؓ کے چھوٹے بیٹے عمر بن ابی سلمہؓ حضور کی پرورش میں تھے۔ اِن کا شمار چھوٹے صحابیوں میں ہوتا ہے۔ کھانا تیار تھا۔ بچے نے دُور بیٹھے ہی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1]۔ اے بیٹے! قریب ہو کر بیٹھو، بسم اللہ پڑھو کُلْ بِیَمِیْنِکَ اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ وَکُلْ مِمَّا یَلِیْکَ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ آپ نے کھانے کے متعلق چار چیزوں کی تعلیم دی جس میں بسم اللہ بھی شامل ہے۔

"ب" اور اسم

بسم اللہ میں اسم کے ساتھ جو "ب" لگی ہوئی ہے اس کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ اس کا مشہور معنیٰ تو مصاحبت یا رفاقت ہے مگر یہ تبرک اور استعانت کے لیے بھی آتی ہے۔ تاہم یہاں پر تینوں معنیٰ مراد ہیں۔ اس طرح بسم اللہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ میں یہ کام اللہ تعالیٰ کے نام کی رفاقت سے اور اس کے نام کی برکت سے اور اُس کی مدد سے شروع کرتا ہوں۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں لفظ اللہ اسم ہے اور رحمان اور رحیم صفات ہیں۔ اسم اللہ تعالیٰ کی ذات کو ظاہر کرتا ہے جب کہ اُس کی ہر صفت اُس کی کسی نہ کسی تجلی کو ظاہر کرتی ہے۔ امام عبدالکریم جیلیؒ نے اپنی کتاب الانسان الکامل میں لکھا ہے[2]۔ کہ اسم وہ شے

---

[1] بخاری ص۸۱۰ ج۲، مسلم ص۱۷۲ ج۲

ہے جو فہم میں معین ہو، خیال میں مصور ہو، وہم میں حاضر ہو، فکر میں مرتب، حافظہ میں محفوظ ہو، عقل میں موجود ہو۔ فرماتے ہیں کہ اسم بول کر ہی ذات کو سمجھا جا سکتا ہے اس کے بغیر ذات کو نہیں سمجھا جا سکتا اور اسم کا مفہوم یہی ہے جو عرض کر دیا۔

اللہ، رحمان اور رحیم

انسان کوئی بھی کام کرنا چاہے، اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے (۱) اسباب فراہم کرنا (۲) انتہا تک پہنچانا (۳) ثمرات مرتّب کرنا۔ جہاں تک اسباب فراہم کرنے کا تعلق ہے، اس پر اسم اللہ کا تصرف ہوتا ہے چونکہ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہے لہٰذا اِسی اسمِ پاک کے ذریعے سے کسی کام کے اسباب مہیا ہوتے ہیں۔ اِن اسباب کو آخر تک قائم رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ کام ادھورا رہ جائے گا چنانچہ اِن اسباب کو انتہا تک قائم رکھنے میں صفت رحمان کارفرما ہوتی ہے۔ کہ وہ بڑا مہربان ہے۔ پھر جب کام مکمل ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات مرتّب کرنے میں صفت رحیم اپنا تقاضا پورا کرتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص کوئی کام کرنے لگتا ہے اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اِن تینوں اسمائے پاک کے وسیلے سے کام کی تکمیل چاہتا ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں[۱] رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَرَحِیْمُ الْاٰخِرَۃِ یعنی صفتِ رحمان میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس دُنیا میں اللہ تعالےٰ ہر نیک و بد اور مومن و کافر پر یکساں مہربان ہے اور سب کو ضروریات زندگی بہم پہنچاتا ہے۔ البتہ صفت رحیم کا تعلق صرف آخرت سے ہے، لہٰذا آخرت کے انعام واکرام صرف مومنوں پر ہوں گے جب کہ کفار مبتلائے عذاب ہوں گے بہر حال

---

[۱] بیضاوی شریف صفحہ ۵ ج ۱

بسم اللہ میں یہ تینوں صفات پائی جاتی ہیں۔ اللہ ذاتی نام ہے اور رحمان و رحیم اس کی صفات ہیں۔ ہر کام کی تکمیل کے لیے ان تینوں اسمائے پاک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے بِسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں تینوں نام آگئے ہیں۔

اسما کو مخفف کرنے کی ریت دُنیا میں عام ہو چکی ہے۔ انگریزی تمدن میں اس وبا کو خصوصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ڈگریوں کے نام ایم اے، بی اے، پی ایچ ڈی کی قبولیت کے بعد اپنے ناموں کی تخفیف بھی عام ہے جیسے زعیم الرحمٰن سلہری کی بجائے زیڈ آر سلہری لکھا اور بولا جاتا ہے۔ اس ضمن میں فقہائے کرام اور محدثین عظام فرماتے ہیں[۱] کہ جو نام اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، اس میں تخفیف کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ جیسے عبدالصمد کو صرف صمد کہنا یا عبدالرحمٰن کو رحمان اور عبدالمجید کو مجید صاحب کہ دینا غلط ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور ان کا اطلاق کسی مخلوق پر کرنا جائز نہیں۔ اس لیے یہ نام مکمل عبدالرحمٰن یا عبدالمجید کہ کر پکارنے چاہیئں جس سے انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا عبد ظاہر کرے۔

ٹھوکر لگنے پر بسم اللہ

اللہ تعالیٰ کے نام کی برکات کا ذکر احادیث میں بھی آتا ہے حضور علیہ السلام سواری پر سوار تھے۔ آپ کے پیچھے ایک دوسرے صحابی بھی بیٹھے تھے۔ اچانک سواری کو ٹھوکر لگی تو پیچھے بیٹھے صحابی نے عربی محاورے کے مطابق کہا تَعِسَ الشَّیطٰنُ یعنی شیطان تباہ ہو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا[۲] ایسا مت کہو، کیونکہ ایسا کہنے سے شیطان سمجھتا ہے کہ میری بھی کوئی حیثیت ہے جس کی وجہ سے مجھے برا بھلا کہا جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسے موقع پر بسم اللہ کہو مسند احمد[۳] کی روایت میں آتا ہے اِذَا قُلْتَ بِسْمِ اللّٰہِ تَصَاغَرَ جب تم بسم اللہ کہو گے

---

[۱] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۹ [۲] عمل الیوم واللیلۃ امام نسائی ص ۳۲ [۳] مسند احمد ص ۵۹ / ج ۵

تو شیطان ذلیل و خوار ہوگا۔ صغیر کا معنی چھوٹا ہوتا ہے۔ فرمایا بسم اللہ کہنے سے شیطان مکھی کے برابر چھوٹا سا بن جاتا ہے۔

معاہدہ حدیبیہ میں بسم اللہ

جب صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پایا تو حضرت علیؑ کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے کہا گیا۔ آپ نے اس کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کی۔ اس پر کفار نے اعتراض کر دیا کہ ہم رحمان اور رحیم کو نہیں جانتے، لہٰذا پرانے طریقے کے مطابق بِسۡمِكَ اللّٰهُمَّ کے الفاظ لکھے جائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَيًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى (بنی اسرائیل) خدا تعالیٰ کو اللہ کے لفظ سے یاد کرو یا رحمان و رحیم کے ساتھ، اس کے سارے نام بھلے ہیں۔ مشرکین محض ہٹ دھرمی کر رہے ہیں کہ رحمان و رحیم کا ذکر پسند نہیں کرتے حالانکہ صفت رحمان سے کمالاتِ وجود اور رحیم سے معنوی اور اُخروی کمالات آتے ہیں۔ بہرحال حضور نے فرمایا کہ مشرکین جس طرح چاہتے ہیں اسی طرح لکھ دو۔ چنانچہ معاہدہ حدیبیہ کی ابتداء صرف اللہ تعالیٰ کے نام سے کی گئی۔

اوّل و آخر قرآن

قرآنِ پاک کی ابتداء بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کی "ب" سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا وَالنَّاسِ کی "س" پر ہوتی ہے۔ اس کے متعلق غزنی کے مشہور شاعر ثنائیؒ جو کہ اولیاء اللہ میں سے تھے، فرماتے ہیں ؎

اول و آخر قرآن زچہ با و سین
یعنی اندر راہِ دیں رہبر تو قرآن بس

قرآن پاک با سے شروع ہوا اور س پر ختم ہوا ہے، دین کے راستے میں تیری

مسلم صہ ۱۰۵/۲ج

راہنمائی کے لیے یہی نسخہ کافی ہے۔ ثنائیؒ نے یہ بھی کہا ہے ؎

گرد قرآن گرد زانکہ ہر کہ از قرآں گرفت
آں جہاں رست از عقوبت ایں جہاں رست از فتن

قرآن کے گرد ہی گھومو کیونکہ جو شخص قرآن پاک سے اخذ کریگا، وہ اُس جہاں میں سزا سے بچ جائے گا اور اِس جہاں میں فتنوں سے مامون رہے گا۔ یہ اس قدر بابرکت کتاب ہے۔ مفسّرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ بندے کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی حالت اِس جہان کی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اس جہاں میں معبودِ برحق کی عبادت کرے، اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے انسان کی دوسری حالت برزخ کی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اِس دُنیا میں ایسے اعمال انجام دے کہ برزخ کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ساتھ لے کر جائے نہ کہ خدا تعالیٰ کے غضب کو لے جائے۔ اگر اُس نے قرآن پاک سے راہنمائی حاصل کی تو برزخ میں بھی سرخرو ہو گا۔ اور پھر آخرت میں تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی مہربانی ہو گی، یہ اُس کی تیسری حالت ہے۔ غرضیکہ جس شخص نے دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے صراطِ مستقیم کو پکڑ لیا، وہ برزخ میں اُس کی صفت رحمان سے مستفید ہو گا اور آخرت میں صفت رحیم کا مستحق بن جائے گا۔

اسماءُ القرآن

قرآنِ پاک کی ابتدا سورۃ فاتحہ سے ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن پاک کی عظمت کا کچھ بیان ہوا تھا۔ اُس کے بعد تعوذ پر مختصر گفتگو ہوئی اور پھر بسم اللہ کے متعلق مختصراً عرض کر دیا ہے اب آج کے درس میں قرآن پاک کے مختلف اسما اور اُن کی مختصر تشریح بیان ہوگی۔

قرآن قرآن کا مادہ قرا ہے، جس کا لفظی معنیٰ جمع کرنا ہے۔ چونکہ پڑھنے میں حروف کو جمع کیا جاتا ہے، اسلیے قرا پڑھنے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور قرآن سے مُراد پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ قرآن پاک کا یہ نام خود قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام) اے پیغمبر! آپ کہ دیں کہ یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے میں تمہیں اور جس جس تک یہ پہنچے انہیں ڈراؤں اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل) یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف) ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھو۔

فرقان قرآنِ پاک کا ایک نام فرقان بھی ہے۔ فرقان کا معنیٰ ہے فیصلہ کرنے والی کتاب۔ قرآن پاک حق و باطل، ایمان و کفر اور صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ یہ نام سورۃ فرقان میں اس طرح آیا ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا بابرکت ہے

وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ تمام لوگوں کے لیے آگاہ کرنے والا اور ڈرانے والا بن جائے۔

تذکرہ تذکرہ کا معنیٰ یاد دہانی ہے۔ قرآن پاک تمام عہد و پیمان اور دیگر ضروری باتیں انسان کو یاد کراتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے تذکرہ کے نام سے پکارا ہے جیسے اِنَّ ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ (المزمل) یہ قرآن یاد دہانی ہے۔ آجکل کی اصطلاح میں تذکرہ کا لفظ عربی میں ٹکٹ پر بھی بولا جاتا ہے، تاہم اس کا اصل معنیٰ یاد دہانی ہی ہے۔

ہدایت قرآنِ پاک ہدایت بھی ہے جیسے فرمایا کہ یہ قرآن ماہِ رمضان میں نازل کیا گیا جو کہ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی (البقرہ) لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں۔ یہ قرآن تمام عالمین اور بالخصوص انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ ہدایت کا معنیٰ راہنمائی ہے اور یہ زندگی کے ہر موڑ پر راہنمائی کرتا ہے کہ لوگ اپنی مشکلات کو کس طرح حل کریں

نور اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور بھی فرمایا وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (النساء) ہم نے تمہاری طرف کھلی روشنی اتاری۔ نور کا لفظی معنیٰ روشنی ہے اور یہ اللہ کی صفت بھی ہے۔ نور کا اطلاق اس مجازی روشنی (light) پر ہوتا ہے اور روحانی روشنی پر بھی جس کے ذریعے انسان کی روح اور قلب منور ہوتے ہیں۔ اُن کے شکوک و شبہات رفع ہو کر پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

بصائر قرآنِ پاک کو بصائر سے بھی تعبیر کیا گیا ہے ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ (الاعراف) یہ تمہارے رب کی طرف سے بصائر ہیں۔ بصائر بصیرت کی جمع ہے جس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو دل میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ بصارت آنکھ

کی روشنی کو کہتے ہیں۔ جب کہ بصیرت دل کی روشنی کو۔

روح — قرآن پاک کا ایک نام روح بھی ہے۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ) اور اس طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ کی طرف روح نازل فرمائی۔ عام اصطلاح میں روح اس چیز کا نام ہے کہ جب کسی جاندار میں داخل ہوتی ہے تو اس کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔ اور جب روح الگ ہو جاتی ہے تو انسان یا کوئی بھی جاندار مردہ ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک اس لحاظ سے روح ہے کہ اس کے ذریعے سے انسانوں کو روحانی زندگی نصیب ہوتی ہے اور وہ گمراہی سے نکل کر روشنی میں آجاتے ہیں۔

رحمت — قرآن پاک رحمت بھی ہے سورۃ نحل میں ہے وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب اتاری جو ہر چیز کی وضاحت کرتی ہے اور یہ ہدایت اور رحمت ہے۔ رحمت کا معنی مہربانی ہوتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ قرآن پاک کو اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن کے شامل حال ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن کو رحمت سے موسوم کیا گیا ہے۔

شفاء — قرآن حکیم کو شفا بھی کہا گیا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (بنی اسرائیل) ہم نے قرآن پاک کو بطور شفا اور رحمت نازل فرمایا اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ جس طرح مادی دوائیں جسمانی بیماریوں کے لیے شفاء کا باعث ہوتی ہیں اسی طرح قرآن پاک روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ ترمذی شریف اور ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے[1] کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا عَلَيْكُمْ بِالشِّفَآئَيْنِ

[1] ابن ماجہ ص ۲۴۶

یعنی شفاء کے لیے دو چیزوں کو لازم پکڑو۔ ایک قرآن پاک ہے جو روحانی بیماریوں سے شفا دیتا ہے اور دوسری شہد ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی جسمانی بیماریوں کی شفا رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چھوٹی سی مکھی کے پیٹ میں نہایت پاکیزہ اور مصفّٰی شہد پیدا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات مکھی کی فطرت میں ڈال دی کہ وہ ہمیشہ پاک چیز، خوشبودار پھول اور صاف ستھری غذا پر بیٹھتی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ شہد کی مکھی گندگی پر نہیں بیٹھتی۔ اگر کوئی مکھی نجاست پر بیٹھی پائی جائے تو سخت سزا کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ جن لوگوں نے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں پر تحقیقات کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ شہد کی مکھیوں کی سردار ملکہ مکھی ہوتی ہے جسے عربی زبان میں یعسوب کہتے ہیں۔ اگر کوئی مکھی گندگی میں ملوث پائی جائے تو فوراً گرفتار کر کے ملکہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اُس کے خلاف جرم ثابت ہو جائے تو ملکہ کے حکم سے اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے شہد کو نہایت ہی پاکیزہ چیز فرمایا ہے۔ یہ مکھیاں اپنے بچوں کو بھی کھلاتی اور انسان بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں بہرحال حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جسمانی بیماریوں کے لیے شہد کو لازم پکڑو اور روحانی بیماریوں کے لیے قرآن کریم کو لازم پکڑو، یہ دونوں چیزیں باعثِ شفا ہیں۔

موعظت

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو موعظت بھی فرمایا ہے جس کا معنیٰ وعظ و نصیحت والی باتیں ہیں۔ اس کے ذریعے انسانوں کی جہالت دُور ہو کر اُن میں اچھی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔

قَهْرُ الْمَدَارِكِ الظُّلْمَانِيَّةِ بِاَنْوَارِ الْمَعَارِفِ الْقُدْسَانِيَّةِ"

وعظ کا معنیٰ یہ ہے کہ انسانی ذہن میں تاریکی والی باتوں کی جگہ روشنی والی پیدا کی جائیں۔

قصے کہانیاں، الٹی سیدھی باتیں فضول محض ہے۔ وعظ ونصیحت بڑی بلند چیز ہے اسی لیے اللہ نے قرآن کا نام موعظت بھی رکھا ہے۔

تبیان

قرآنِ حکیم کا نام تبیان بھی ہے۔ بیان تو عام وضاحت STATEMENT کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر تبیان کا معنی بہت زیادہ وضاحت ہے وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل) ہم نے آپ پہ ایسی کتاب اُتاری ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرتی ہے۔ وہ تمام باتیں جن کا تعلق عقیدے سے ہے یا عمل سے، اخلاق سے ہے یا ذہنی بالیدگی سے، فکر کی بلندی سے ہے یا اللہ کی معرفت سے، عالم بالا سے ہے یا برزخ اور حشر سے، اُن تمام کی وضاحت قرآن پاک میں موجود ہے، اس لیے اس کا نام تبیان رکھا گیا ہے۔

قیّم

قرآن پاک کا ایک نام قیّم بھی ہے۔ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّنْ لَّدُنْهُ (الکھف) اللہ تعالیٰ نے ایسی کتاب نازل کی ہے جو قیّم ہے تاکہ ڈرائے اس سخت عذاب سے جو اللہ کی طرف سے آنے والا ہے۔ قیّم کا معنی نگرانی اور حفاظت کرنے والی بھی ہے۔ یہ کتاب نگرانی کرتی ہے اور غلط چیزوں کو بالکل جدا کر دیتی ہے۔ قیّم کا معنی اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء) میں بھی ملتا ہے یعنی مرد عورتوں کے نگران اور محافظ ہیں۔ عربی زبان میں "قیّم جماعت" سیکرٹری کو کہتے ہیں، اُس کا نام بھی تمام امور کی نگرانی ہوتا ہے۔

احسن الحدیث

قرآن پاک نے اپنا نام احسن الحدیث بھی بتایا ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ (الزمر) اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی۔ وہ شہنشاہِ مطلق اور ملک الملوک ہے، اُس کا کلام بھی بے مثل اور بے مثال ہے، اس لیے قُرآن کو احسن الحدیث

فرمایا گیا ہے۔ خطبہ جمعہ میں بھی آپ سنتے رہتے ہیں اَحْسَنَ الْکَلَامِ کَلَامُ اللّٰہِ سب سے بہتر کلام، اللہ کا کلام ہے۔ اس سے بہتر کائنات میں کوئی کلام نہیں لہٰذا یہ احسن الحدیث بھی ہے۔

مثانی — مثانی کا معنیٰ دہرائی جانے والی کتاب جس کا بکثرت تکرار ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک کا یہ نام خود قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا سورۃ زمر میں ہے اللہ نے بہترین بات نازل فرمائی جو کہ کِتٰباً مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ جس کی آیتیں ملتی جلتی ہیں اور دہرائی جاتی ہیں۔

برہان — قرآن پاک کا ایک نام برہان بھی ہے۔ برہان دلیل کو کہتے ہیں۔ ہر دعویٰ کی کوئی نہ کوئی دلیل ہوتی ہے، اسی طرح قرآنِ حکیم بھی بیشمار دلائل پر مشتمل ہے۔ توحید کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے دلائل بیان فرمائے ہیں، اسی طرح شرک کے ردّ میں دلائل کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ وقوعِ قیامت کے متعلق مختلف طریقوں سے بے شمار دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم کو برہان بھی کہا گیا ہے۔ سورۃ نساء میں ہے قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آچکی ہے

الکتاب — قرآن پاک کو الکتاب کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی ابتداہی اسی لفظ سے ہوئی ہے ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ بلاشبہ یہی وہ کتاب ہے۔ سورۃ الحجر میں ہے تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ یہ الکتاب اور قرآن مبین کی آیتیں ہیں۔ دراصل الکتاب کہلانے کی حقدار صرف وہی کتاب ہو سکتی ہے جس کی حیثیت بلند و بالا ہو اور جو عیب اور نقص سے پاک ہو اور یہ شرف صرف قرآن پاک کو ہی حاصل ہے۔ بعض نے مجازی عنوان سے بات اس طرح

سمجھائی ہے" این کتاب نیست چیزے دیگر است" دنیا میں لاتعداد مضامین پر مشتمل کتابیں موجود ہیں، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ٹیکنالوجی، نفسیات، معاشیات، سیاسیات، دینیات، مگر ہر کتاب میں علمی دلائل کی کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہوگی۔ یہ شرف صرف قرآن پاک کو ہی حاصل ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے یہی الکتاب ہے۔

ذکر

قرآنِ پاک کا ایک نام ذکر بھی ہے۔ ذِکر دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ذکر کا ایک معنیٰ وہ علم ہے جس کے ذکر سے انسان میں یادداشت پیدا ہوتی ہے اور دوسرا ذکر وہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالےٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے سُورۃ احزاب میں ہے۔ اے ایمان والو! اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا اپنے اللہ کا کثرت سے ذکر کرو۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اَكْثِرُوا ذِكْرَ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوا مَجْنُوْنٌ اللہ تعالیٰ کا ذِکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ کہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔ بہر حال اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک کو ذکر کا لقب بھی دیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحجر میں آتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یہ ذکر ہم نے ہی اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

مسائلِ تلاوت

ربطِ مضامین

سب سے پہلے عظمتِ قرآنِ پاک کا کچھ بیان ہوا تھا۔ اس کے بعد اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے متعلق کچھ مختصر طور پر عرض کیا تھا۔ پھر قرآنِ حکیم کے اسمائے مبارکہ کی مختصر تشریح پیش کی تھی اور اب آج قرآن پاک کی تلاوت سے متعلق کچھ مسائل کا بیان ہو گا۔ اس کے بعد طریقہ تفسیر کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا اور پھر انشاء اللہ سورۃ فاتحہ کی فضیلت بیان ہو گی اور اس کے الفاظ کی تشریح عرض کی جائے گی۔

تلاوتِ قرآن کا اجر

اِس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ذرائعِ علم میں سے اہم ترین ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی ذریعہ سے مکمل علم قرآنِ پاک کی صورت میں نازل فرمایا ہے جو کہ پوری انسانیت بلکہ پوری کائنات کے لیے ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ قرآن کریم کو سیکھنا اور پھر اُس پر عمل کرنا تو فرض ہے، تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کی تلاوت کا مسئلہ بھی خود اسی میں ذکر فرمایا ہے ارشاد ربانی ہے اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ (العنکبوت) جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کریں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ (البقرہ) جو صادق الایمان لوگ ہیں وہ قرآنِ پاک کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔ یہی لوگ حقیقت میں ایمان والے ہیں اور ایسے ہی لوگ اجر کے زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت[1] میں آتا ہے کہ جو شخص قرآنِ پاک کی

---

[1] ترمذی ابواب فضائل القرآن ص ۱۱۹ ج ۲

ایمان اور سچائی کے ساتھ تلاوت کریگا اُسے قرآن کریم کے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔ خواہ اِن کا مطلب بھی نہ سمجھتا ہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا الٓمٓ تین حروف ہیں اور ان کی تلاوت سے تیس ۳۰ نیکیاں حاصل ہوں گی۔ اللہ تعالےٰ نے خود قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ قرآن کے متعلق پہلے درجے کی بات یہ ہے کہ لوگ اس پر ایمان لائیں، اسمیں غور و فکر کریں اور اس کے مطابق عمل کریں، یہ تو ضروری ہے۔ اور پھر دوسرے درجے کی بات یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ کی تلاوت پر بھی اجر و ثواب ہے۔ قرآن پاک کے علاوہ کسی دوسرے کلام کی تلاوت پر اتنا اجر نہیں جتنا اس کی تلاوت پر ہے۔ لہٰذا اس کی تلاوت کرنے والا اگر ایماندار ہے تو یقیناً اُس کو اجر حاصل ہوگا۔

ایصالِ ثواب

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرنے والا اجر و ثواب کا مستحق ہے مگر حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا یہ ثواب پڑھنے والے کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو بھی حاصل ہوسکتا ہے یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں قرآن خوانی کرکے اُس کا ثواب دوسروں کو ایصال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں آئمہ کرام کا اختلاف[1] ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تلاوتِ قرآن کا ثواب خود تلاوت کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے، کسی دوسرے کو ایصال نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مرنے والوں کو صدقہ خیرات، استغفار یا دُعا کا ثواب تو پہنچتا ہے، حج اور عمرہ کا ثواب بھی ملتا ہے مگر تلاوت قرآن کا ثواب صرف پڑھنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔ البتہ امام ابُوحنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح دعا، استغفار یا صدقہ وغیرہ کا ثواب دوسروں کو پہنچتا ہے، اسی طرح اُمید

---

[1] فتاویٰ کبریٰ لابن تیمیہ ص ۳۱۵ ج ۲۴

ہے کہ تلاوت قرآن کا ثواب بھی پہنچے گا۔ فرماتے ہیں کہ تلاوتِ قرآن ایک نیک عمل ہے اور نیک عمل کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے کہ اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ جس طرح صدقہ خیرات دوسرے کے ساتھ احسان ہے، اسی طرح تلاوت بھی احسان ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُمید ہے کہ تلاوت کا ثواب بھی پہنچتا ہے۔ تلاوت کے بعد تلاوت کرنے والا اس طرح دُعا کرے کہ جو کچھ میں نے تلاوت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کا اجر اپنے والدین، اساتذہ، کسی بزرگ، عزیز رشتہ دار، دوست یا پیغمبر علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ جس کو بھی چاہے ہبہ کر سکتا ہے۔

نفلی عبادت کا ثواب

فقہ حنفی کا یہ مشہور و معروف مسئلہ[1] ہے کہ ہر ایماندار شخص اپنے نفلی عمل میں سے جتنا چاہے دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے۔ جہاں تک فرائض، واجبات اور سنن کا تعلق ہے اُن عبادات کی ضرورت تو خود انجام دہندہ کو ہوتی ہے۔ ایسے امور کی ادائیگی کے لیے وہ خود جواب دِہ ہے، لہٰذا اُن کو تو ہبہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ نفلی عبادات میں دوسروں کو ہبہ کرنے کی اجازت ہے۔ اِسی مسئلہ کے تحت یہ ضمنی مسئلہ بھی آتا ہے کہ فرائض کے علاوہ تلاوتِ قرآن کا ثواب بھی دوسرے کو بخش سکتا ہے۔ کوئی شخص دو چار رکعت نفل نماز ادا کر کے یوں دُعا کر سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اُس [illegible] ب اس کے والدین یا دیگر اقرباء کو پہنچائے۔ اِسی طرح روزہ کا مسئلہ بھی ہے فرض روزہ تو انسان خود اپنے لیے رکھے گا، اس کا ثواب دوسروں کو نہیں پہنچا سکتا البتہ نفلی روزے کا ثواب ایصال کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی مرنے والے کا فرض روزہ رہ گیا ہے تو اُس کی تلافی اس کا کوئی عزیز نفلی روزے کے ذریعے نہیں کر سکتا اگر

---

[1] ہدایہ ص ۲۹۶ ، ۲۹۷ ج ۱

کسی شخص کا فرضی یا نذر کا روزہ چھوٹ جائے تو حدیث شریف میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت[۱] ہے کہ اُس کا سرپرست اسکی طرف سے روزے کا فدیہ ادا کرے۔ ہر روزے کا فدیہ صدقہ فطر کے مطابق دو سیر گندم یا اُس کی قیمت کے برابر ہے۔ ہر نماز کا بھی یہی فدیہ[۲] ہے۔ اگر کسی مرنے والے کی نماز ضائع ہو جائے۔ تو اُس کے وارثان ہر نماز کے بدلے صدقہ فطر کے برابر فدیہ ادا کریں۔ اگر مرنے والا وصیت کر گیا ہے تو پہلے اُس کے مال میں سے فدیہ ادا کیا جائے اور پھر باقی مال تقسیم ہو گا اور اگر وہ خود وصیت نہیں کر گیا تو اُس کے عزیز یا دوست احباب فدیہ ادا کریں۔

بہر حال امام ابُوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک نفلی نماز، روزہ یا تلاوت کا ثواب کسی دوسرے کو ایصال کرنا درست ہے اور بالعموم اسی پر عمل کیا جاتا ہے۔ قبرستان جانے والے کو بھی یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ سُورۃ فاتحہ اور تین دفعہ قل شریف پڑھے یا سورۃ یٰسین پڑھے اور اس کا ثواب اموات کو بخش دے۔ یہ جائز ہے۔

قرآن کا بھول جانا

بعض لوگوں پر نسیان کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ قرآن پاک پڑھنے کے بعد بھول جاتے ہیں، حدیث شریف میں آتا[۳] ہے کہ جس شخص کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے وہ یہ نہ کہے کہ میں نے قرآن پاک بُھلا دیا ہے اس میں زیادتی پائی جاتی ہے اور ایسا کہنا ناپسندیدہ ہے ایسے شخص کو نہایت عاجزی کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ مجھ سے قرآن پاک بُھلا دیا گیا ہے۔ اس میں عاجزی پائی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے۔

تلاوت بطور پیشہ

ایک مسئلہ یہ بھی[۴] ہے کہ قرآن کریم کو اپنی کمائی کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے۔ امام بخاریؒ بہت بڑے محدث ہوئے ہیں۔ صحیح بخاری کے علاوہ

---

۱ بخاری ص۲۶۲ ج۱، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ص۵۹ ج۱۱، ۲ ہدایہ ص۲۲۲ ج۱

۳ بخاری ص۷۵۳ ج۲، مسلم ص۲۶۸ ج۱ ۴ ہدایہ ص۳۰۳ ج۲

آپ کی اور بھی بہت سی تصانیف ہیں مثلاً ادب المفرد، تاریخ صغیر، تاریخ اوسط تاریخ کبیر وغیرہ۔ تاریخ کبیر نو جلدوں پر مشتمل ضخیم کتاب ہے۔ آپ نے اس کتاب میں روایت نقل کی ہے[1] جس کی سند بھی قابلِ اعتبار ہے۔ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی ظالم آدمی کے ہاں اس نیت سے قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے کہ اس کے پاس میری وقعت ہو جائے یا یہ مجھے اچھا سمجھنے لگے، تو ایسے شخص کو ہر ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیوں کی بجائے دس دس لعنتیں پڑتی ہیں۔ اس نے اللہ کی کتاب کی اس قدر ناقدری کی کہ ایک ظالم آدمی کی خوشنودی کے لیے قرآن پاک کی تلاوت کی ہے۔ یہ قرآن پاک کو پیشہ بنانے کے مترادف ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[2] کہ ایسا دور بھی آئے گا جب لوگ قرآنِ کریم کو کھانے کا ذریعہ بنا لیں گے۔ مختلف رسومات کی آڑ میں قرآنِ پاک کھانے پینے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہ درست نہیں ہے۔

ختم قرآن پہ دعا

قرآن پاک کی تلاوت کے بعد دعا کرنا مستحب ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آپ قرآن پاک اوّل تا آخر ختم کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرکے دعا مانگتے تھے۔ یہ دعا کی قبولیت کا موقع ہوتا ہے۔ تراویح میں ختم قرآن پر بھی دعا کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ یہ بھی مستحب ہے، قرآن پر ایمان لانا، اس کے مطابق عقیدہ رکھنا اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا تو بہر حال ضروری ہے مگر اس کی خالی تلاوت بھی بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔

قرآن پاک کا سننا

جس طرح قرآن پاک کا پڑھنا مسنون ہے اسی طرح اس کا سننا بھی مستحب ہے۔ جو شخص خود نہیں پڑھ سکتا، وہ دوسرے سے سنے۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام منبر پر تشریف فرماتے تھے[3]۔ آپ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا، قرآن پڑھو۔

---

[1] [2] مسند احمد ص ۳۹۷، ۱۴۶ ج ۳ [3] مسلم ص ۲۷۰ ج ۱، بخاری ص ۶۵۹ ج ۲

انہوں نے عرض کیا حضور! قرآن پاک آپ پر نازل ہوا ہے، آپ پڑھتے ہیں، اور ہم لوگ سُنتے ہیں مگر اب آپ ہمیں پڑھنے کے لیے فرما رہے ہیں۔ فرمایا اِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَ مِنْ غَیْرِیْ یعنی میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ دوسرے کی زبان سے قرآن کریم سنوں۔ گویا جس طرح خود پڑھنا اعلیٰ درجے کی نیکی ہے، اسی طرح سُننا بھی پسندیدہ ہے۔ حضور علیہ السلام کے حکم کی تعمیل میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے سُورۃ نساء کی تلاوت شروع کی اور کئی رکوع پڑھ گئے۔ پھر جب آپ اس آیت پر پہنچے فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ لہٰذا حضرت ابن مسعودؓ خاموش ہو گئے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے تلاوت بند کر دینے کا اشارہ فرمایا۔ بہرحال جب کوئی دوسرا شخص پڑھ رہا ہو تو قرآنِ کریم کو سُننا چاہیئے کہ یہ بھی ایک بہتر بات ہے۔

تلاوت میں خوش الحانی

قرآن پاک کو اچھے لہجے اور خوش الحانی سے پڑھنا بھی مستحب اور اُس کی ترغیب دی گئی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ عربوں کے لہجہ پر اچھی آواز سے تلاوت کرنی چاہیئے۔ آجکل بعض لوگ شعر و شاعری اور عشقیہ گانوں کے طریقے پر قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں جو کہ مکروہ تحریمی اور گناہ کا باعث ہے اسے فقہائے کرام ناجائز قرار دیتے ہیں۔

تلاوتِ قرآن پاک کے ضمن میں یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ جس جگہ پر تلاوت کی جائے وہ صاف ستھری اور پاکیزہ ہونی چاہیئے۔ اردگرد کا ماحول بہتر ہو۔ مسجد تو بہرحال پاکیزہ مقام ہوتا ہے۔ اگر گھر میں بھی تلاوت کرے تو ایسی جگہ بیٹھے جہاں

---

[1] فیض القدیر شرح جامع صغیر ص ٦٥ ج ٢ بحوالہ طبرانی اوسط

قریب گندگی نہ ہو، بدبو والی جگہ پر قرآن کی تلاوت سوءِ ادب ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ تلاوت نہایت عاجزی کے ساتھ کرے اور ممکن ہو تو قبلہ رو ہو کر تلاوت کرے قاری کے اپنے جسم اور لباس کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ یہ مسئلہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ قرآنِ پاک کی افضل ترین تلاوت وہ ہے جو نماز کے دوران کی جائے۔ ایسی تلاوت کا ثواب سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم کی تلاوت سے متعلق یہ چند ایک ضروری مسائل تھے جو میں نے عرض کر دیئے ہیں۔

فضائلِ قرآن اور اصولِ تفسیر

ربطِ مضامین

قرآنِ کریم کے بارے میں چند ضروری مسائل کل عرض کیے تھے۔ اب قرآن پاک کی فضیلت بحیثیت مجموعی اور اس کے طریقہ تفسیر کے متعلق کچھ باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سُورۃ فاتحہ کی فضیلت اور اس کے الفاظ کی تشریح وغیرہ بیان ہوگی۔

اشرف کتاب

امام ابن کثیرؒ آٹھویں صدی ہجری کے بڑے پائے کے مفسرِ قرآن ہوئے ہیں۔ آپ نے بخاری شریف کی شرح بھی لکھی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے تاریخ کی بڑی مستند کتاب لکھی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آٹھویں صدی تک کی تاریخی روایات سند کے ساتھ بیان کی ہیں۔ قرآن پاک کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں[1] کہ قرآن حکیم تمام کتابوں سے اشرف کتاب ہے۔ شرافت اور عزت میں اس کے برابر کوئی دوسری کتاب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں فرمایا ہے اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ (الزمر) اللہ نے سب سے بہتر بات نازل فرمائی ہے۔ حدیث کا لغوی معنی بات ہے۔ سورۃ مرسلات میں ہے فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ اگر خدا تعالیٰ کے قرآن میں نازل کردہ بات پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر اس کے بعد کون سی بات اور کون سی کتاب نازل ہونے والی ہے جس پر تم ایمان لاؤ گے۔ قرآنِ کریم ہی تمام کتابوں سے اشرف کتاب ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر صـــ

اشرف رسول

اللہ تعالیٰ نے یہ اشرف کتاب اپنے اشرف رسول پہ نازل فرمائی قرآن پاک میں ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب) اللہ نے تمام نبیوں کے خاتم اور سب سے فضیلت اور شرافت والے نبی پر یہ قرآنِ حکیم نازل فرمایا۔ سورۃ البقرہ میں ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یہ سب رسول ہیں۔ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ پھر ان میں سے حضور علیہ السلام کے درجات تو تمام انبیاء و رسل سے بلند ہیں۔ تو اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولوں میں سے سب سے اشرف رسول پر یہ کتاب نازل فرمائی۔

اشرف فرشتہ

اور پھر جس فرشتے کے ذریعے قرآن پاک کا نزول ہوا یعنی جبرائیل علیہ السلام وہ فرشتہ بھی سب فرشتوں سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں فرمایا ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعراء) یہ عظیم کتاب ہم نے جبرئیل امین کے واسطہ سے نازل فرمائی۔

اشرف سرزمین

پھر یہ بھی ہے کہ قرآنِ حکیم جس خطہ زمین پہ نازل ہوا، وہ خطہ تمام خطوں سے زیادہ فضیلت والا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ اللہ کا پہلا گھر جس خطہ میں بنایا گیا وہ بکہ یعنی مکہ مکرمہ میں ہے۔ یہ بڑا ہی بابرکت اور جہان بھر کے لیے مرکزِ ہدایت ہے۔ یہ حرم پاک ہے جہاں اللہ کا گھر بیت اللہ شریف ہے۔ اسی سرزمین میں اللہ نے قرآنِ پاک کو نازل فرمایا۔

اشرف مہینہ

جس ماہِ مبارک میں یہ قرآن نازل ہوا، وہ مہینہ بھی سب مہینوں سے افضل ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ) یہ ماہِ رمضان ہے جسمیں

قرآنِ پاک کا نزول ہوا اور یہ افضل ترین مہینہ ہے۔

اشرف رات

جس رات میں قرآنِ پاک نازل ہوا وہ رات بھی تمام راتوں سے افضل ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ یہ ایسی بابرکت رات ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں سے افضل ہے چنانچہ قرآن کریم کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اُس کا نزول سب سے اشرف رات میں ہوا۔

امام ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ فَکَمُلَ مِنْ کُلِّ الْوُجُوْهِ پس قرآن پاک کی فضیلت تمام وجوہ سے مکمل ہے جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے قرآن پاک شرف اور فضیلت رکھنے والی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشراف و فضائل کو قرآنِ پاک پر ختم کر دیا ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن

قرآنِ پاک کی تفسیر کے سلسلے میں بعض چیزیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں۔ سلف صالحین کا طریق کار یہ ہے کہ وہ قرآن پاک کی تشریح اور وضاحت سب سے پہلے خود قرآن پاک میں تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کو ایک مسئلہ کے متعلق تردد تھا کہ آیا یہ قرآن میں ہے یا نہیں۔ انہوں نے تین سو مرتبہ قرآن کی ورق گردانی کی، تب جا کر اُنہیں وہ آیت معلوم ہو گئی جس سے مسئلہ کا حل نکل آیا۔ تاہم مسئلہ کا استخراج وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صاحبِ علم ہوتے ہیں، جو کثرت سے کتابیں پڑھتے ہیں ان کے حافظے قوی ہوتے ہیں اور وہ تمام مشکلات سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ بہر حال قرآن پاک کی تفسیر کا پہلا اصول یہ ہے کہ اُسے خود قرآن میں تلاش کرو، اگر ایک جگہ اجمال ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے مل جائے گا یا اگر ایک مقام پر اصول بیان ہوا ہے۔ تو

لہ تفسیر کبیر صہ ۴۳ ج ۱۱

دوسری جگہ کچھ وضاحت بھی موجود ہوگی۔

تفسیر بالسنۃ

اگر کوئی مسئلہ قرآنِ حکیم سے پورے طور پہ واضح نہ ہو تو پھر اُس کی تشریح کیلیے سنّت سے رجوع کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل) کہ جو چیز اتاری گئی ہے آپ اُس کی وضاحت کر دیں۔ امام ابن تیمیہؒ[1] حنبلی مسلک کے بہت بڑے امام ہوئے ہیں، آپ مجاہد اور غازی بھی تھے، وہ فرماتے ہیں فَالسُّنَّةُ تُبَيِّنُ الْقُرْاٰنَ وَتُفَسِّرُهٗ یعنی سنت ایسی چیز ہے جو قرآن پاک کو بیان کرتی ہے اور اُس کی تفسیر کرتی ہے ——— امام شافعیؒ اور ہمارے اکابرین میں امام شاہ ولی اللہؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے صاف لکھا ہے کہ جتنی بھی صحیح احادیث ہیں، وہ قرآن کریم کی شرح ہیں، قرآن پاک کے الفاظ وحی جلی ہیں، لیکن جو باتیں حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے بیان ہوئی ہیں، وہ وحی خفی ہیں، بہر حال قرآن پاک کے بعد تفسیر کا دوسرا ذریعہ حدیث ہے مطلوبہ تفصیل وہاں سے تلاش کی جائیگی۔

معاذ بن جبلؓ اور اجتہاد

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف دو حیثیتوں کے ساتھ روانہ فرمایا۔ آپ اس علاقہ کے حاکم بھی تھے اور آپ کو مبلغ اسلام کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ روانگی کے وقت حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ سے[2] پوچھا کہ جب تمہارے سامنے مقدمات پیش ہوں گے تو اُن کا فیصلہ کیسے کرو گے۔ عرض کیا، حضور! سب سے پہلے میں مسئلہ کا حل قرآن پاک میں تلاش کروں گا اگر وہاں سے راہنمائی حاصل ہوگئی تو اُس کے مطابق فیصلہ کروں گا اور وہاں کوئی چیز صراحتاً نہ مل سکی تو پھر آپ کی سنت میں دیکھوں گا اور اگر وہاں بھی نہ پاسکا ثُمَّ اَجْتَهِدُ

---

[1] فتاویٰ کبریٰ لابن تیمیہ صـ ۱۳۸ ج ۳ [2] تفسیر ابن کثیر صـ ۳ ج ۱

پھر میں اجتہاد کروں گا۔ اور جو بات قرآن و سنّت کے مطابق معلوم ہوگی، اُس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ یہ سُن کر حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللّٰہِ لِمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے رسُول کے بھیجے ہوئے کو اُس چیز کی توفیق دی ہے جس کو وہ پسند کرتا ہے اور جس پر راضی ہوتا ہے گویا یہ اصول وضع ہو گیا کہ جب کوئی چیز قرآن و سنت سے نہ مل سکے تو پھر ایسا مسئلہ اہل علم اجتہاد کے ذریعے حل کریں گے۔

امام ابُوحنیفہؒ کا طریقہ تفسیر

امام ابُوحنیفہؒ کا طریقہ تفسیر یہی ہے کہ وہ ہر مسئلے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہاں صراحت نہیں ملتی تو پھر حدیثِ رسُول میں تلاش کرتے ہیں۔ اگر حدیث میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو پھر اقوالِ صحابہؓ کو دیکھتے ہیں۔ اگر صحابہ کرامؓ کسی مسئلہ پر متفق ہوں تو آپ اس کو اختیار کر لیتے ہیں اور اگر صحابہؓ میں اختلاف ہو تو پھر امام صاحب اقوالِ صحابہؓ میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر صحابہؓ کے اقوال سے بھی معاملہ واضح نہ ہو تو پھر تابعین کے متعلق آپ فرماتے ہیں هُمْ رِجَالٌ وَّنَحْنُ رِجَالٌ وہ بھی اس میدان کے مرد ہیں اور ہم بھی اس میدان کے مرد ہیں چونکہ امام صاحب خود صغار تابعین میں سے ہیں، اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ ہم خود اجتہاد کر کے مسئلے کا حل دریافت کریں گے، تاہم آپ کتاب اللہ، سنّت رسُول اللہ اور اجماع صحابہؓ کو اولیت دیتے ہیں اور چوتھے نمبر پہ اجتہاد کو اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اصولِ فقہ والوں نے شریعت کے چار ہی دلائل بیان کیے ہیں یعنی اللہ کی کتاب، نبی کی سنّت، صحابہ کا اتفاق اور پھر اجتہاد۔

خود امام صاحب[1] نے ایک علمی کمیٹی بنا رکھی تھی جس میں امام ابُو یوسفؒ، امام محمدؒ داوٗد طائیؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ جیسے بڑے بڑے لوگ شامل تھے جب کوئی حل طلب مسئلہ

---

[1] جامع المسانید صفحہ ۳۱ تا ۳۲ ج ۱، میزان الکبریٰ صفحہ ۵۹

آتا تو اس چالیس رکنی کمیٹی کے سامنے پیش ہوتا۔ امام صاحب بھی مجلس میں شامل ہوتے، متعلقہ مسئلہ پر بحث مباحثہ ہوتا اور پھر راجح امر کو لکھ لیا جاتا۔ امام صاحب اور آپ کے شاگردان نے جو مسائل اجتہاد کے ذریعے حل کیے ہیں ان کی تعداد بارہ لاکھ سے کم نہیں۔

عبداللہ ابن مسعودؓ

کسی معاملہ میں صحابہؓ کے درمیان اختلاف کی صورت میں بعض کو بعض پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً جہاں کہیں خلفائے راشدینؓ میں سے کسی کا قول آجائے گا۔ وہ قابل ترجیح ہوگا۔ کیونکہ اُن کے بارے میں خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اُن کی سُنت کو مضبوطی سے پکڑو[1] کیونکہ یہ ہدایت اور استقامت پر ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بات قابل تسلیم ہوگی کیونکہ انہوں نے قرآن پاک کا اکثر حصہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے براہِ راست سیکھا تھا۔ آپ ہی کی زبان مبارک سے قرآن پاک کی تشریح سُنی تھی، چنانچہ امام احمدؒ نے بھی خلفائے راشدین کے بعد ابن مسعودؓ کا ذکر کیا ہے۔ خود آپ کا دعویٰ تھا[2] وَالَّذِی لَآ اِلٰہَ غَیْرُہٗ مَا نَزَلَتْ مِنْ اٰیَۃٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ فِیْ مَنْ نَزَلَتْ وَاَیْنَ نَزَلَتْ مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں قرآن کریم کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی مگر میں جانتا ہوں کہ کس کے حق میں اور کس جگہ نازل ہوئی فرماتے تھے وَلَوْ اَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمُ بِکِتَابِ اللّٰہِ اگر مجھے علم ہو کہ قرآن کو مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی ہے اور میں اس تک سواری پر پہنچ سکتا ہوں تو یقیناً سوار ہو کر اس کے پاس جاتا اور اس سے علم سیکھنے کی کوشش کرتا۔ آپ کا یہ بھی قول[3] ہے کہ ہم جماعتِ صحابہؓ کی حالت یہ تھی۔ کہ جب دس آیتیں نازل ہوتی تھیں تو ہم آگے

---

[1] ترمذی ص ۹۶ ج ۲، کتاب العلم [2] تفسیر ابن کثیر ص ۳ ج ۱

[3] تفسیر ابن کثیر ص ۳ ج ۱

نہیں بڑھتے تھے جب تک ان کے معانی اور اُن پر عمل کرنے کے طریقے کو نہ جان لیتے اور پھر ہر قابلِ عمل حکم پر عمل کرتے۔ آپ کے الفاظ اس طرح ہیں۔ حَتّٰى يَعْلَمُوا بِمَا فِيهَا مِنَ الْعَمَلِ فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا۔

عبد اللہ بن عباسؓ

صحابہ کرام میں سے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی شخصیت بھی بہت مشہور ہے خود حضور علیہ السلام نے آپ کے متعلق دُعا کی تھی[۱] اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ اے اللہ اس بچے کو کتاب کا علم سکھا اور اسے دین میں سمجھ عطا کر حضور علیہ السلام کے وصال کے وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر صرف گیارہ یا بارہ برس تھی، تاہم آپ دینی معاملات میں بڑے متجسس تھے اکثر حضور کے گھر میں اپنی خالہ کے ہاں قیام کرتے تاکہ رات کے وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعمال کا مشاہدہ کر سکیں، ایک دفعہ حضور[۲] قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے، حضرت ابن عباسؓ نے آپ کے لیے پانی کا لوٹا رکھ دیا۔ حضور واپس تشریف لائے تو دریافت کیا یہ لوٹا کس نے رکھا ہے آپ کو بتایا گیا کہ ابن عباسؓ نے رکھا ہے آپ نے اس موقع پر دُعا کی اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ اے اللہ! اس کو حکمت اور دانائی سکھا دے۔ اس کو کتاب اللہ کا علم سکھا دے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی اور اللہ نے آپ کو علم کا وافر حصہ عطا فرمایا۔ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ، حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں تھوڑا عرصہ گورنری پر متمکن رہنے کے علاوہ ساری عمر قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے رہے حضرت مجاہدؒ جیسے آپ کے بعض شاگرد ایسے بھی ہیں جنھوں نے آپ سے تیس ۳۰ مرتبہ قرآن پاک اول تا آخر سیکھا اور پوری تفسیر وتشریح سے مستفید ہوئے۔ خود حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو

---

۱ تفسیر ابن کثیر ص ۳ ج ۱ ۲ بخاری ص ۵۳۱ ج ۱ ص ۲۶ ج ۱

نِعْمَ تَرْجُمَانُ الْقُرْآنِ کا خطاب دیا[1] ہے۔ یعنی آپ قرآنِ پاک کی بہترین ترجمانی کرنے والے ہیں۔ بہرحال حضرت ابن مسعودؓ کے بعد حضرت ابنِ عباس کی تشریح دیکھی جائے گی کہ انہوں نے قرآن کی کسی آیت کا کیا مطلب لیا ہے۔

تفسیر بالرائے حرام ہے

تفسیر بالرائے یعنی محض اپنی ذاتی رائے سے قرآنِ پاک کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی رائے رکھتا ہے جو قرآنِ پاک کی مراد نہیں ہے اور پھر وہ اُسے قرآن کی کسی سورۃ یا آیت پر چسپاں کرتا ہے تو یہ انتہائی درجے کی گمراہی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام سلف صالحین اللہ تعالیٰ کی منشاء معلوم کر کے اُس کے مطابق قرآنِ حکیم کی تفسیر کرتے رہے ہیں۔ اور کسی نے اللہ کی منشاء کے خلاف اپنی رائے کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ تفسیر بالرائے ڈاکہ، چوری اور زنا سے بھی بڑا جرم ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان[1] ہے مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِہٖ اَوْبِمَا لَا یَعْلَمُ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ جس شخص نے قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کی یا ایسی بات کی جس کو وہ نہیں جانتا تو ایسا شخص اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے۔ حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا[3] مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِہٖ فَقَدْ اَخْطَأَ جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی اُس نے غلطی کی۔ اگرچہ اُس نے ٹھیک بات کی ہو، مگر پھر بھی اُس نے اپنی ذاتی رائے شامل کر کے غلطی کا ارتکاب کیا ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں[4] مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْیِہٖ فَقَدْ کَفَرَ جس نے قرآنِ پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کی اُس نے گویا کفر کا ارتکاب کیا۔

امام ابن کثیرؒ نے یہ روایت نقل کی[5] ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پوچھا

۱۔ تفسیر ابن کثیر ص ۴ ج ۱ ۔ ۲۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵ ج ۱ ۔ ۳۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵ ج ۱

۴۔ تفسیر قرطبی ص ۳۲ ج ۱ ۔ ۵۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵ ج ۱

گیا کہ فَاکِهَةً وَّاَبًّا میں فَاکِهَةً کا معنیٰ تو معلوم ہے اَبًّا کا کیا مطلب ہے؟ اِس پر آپ نے فرمایا اَیُّ سَمَآءٍ تُظِلُّنِیْ وَاَیُّ اَرضٍ تُقِلُّنِیْ اِذَا اَنَا قُلْتُ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ مَا لَآ اَعْلَمُ مجھ پر کونسا آسمان سایہ کرے گا۔ اور کون سی زمین مجھ کو اٹھائیگی جب میں اللہ کی کتاب کے بارے میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس معاملے میں تکلف نہیں کرنا چاہیئے۔ جس کا علم نہ ہو، وہ اپنی رائے سے نہیں بتانی چاہیئے بلکہ صاف کہ دینا چاہیئے کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے[1] کہ جو کچھ جانتے ہو وہ بتاؤ اور جو نہیں جانتے انہیں اہل علم کی طرف سونپ دو۔ بلا علم اپنی رائے کو دخیل نہ کرو، یہ گمراہی ہے۔

تباہی کے اسباب

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہمارے دور کے قرآن کے بہت بڑے عالم ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے آپ ہی سے قرآن پڑھا تھا۔ آپ نے اُن کو وصیت کی تھی کہ احمد علی قرآن پڑھانے کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرنا۔ چنانچہ اِس وصیت کے مطابق حضرت لاہوریؒ نے ساری عمر قرآن پاک کی تعلیم دی اور آپ کے شاگرد دُور دُور تک پھیل گئے۔ تو مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں[2] کہ مُسلمانوں کو دو چیزوں نے تباہ کیا ہے ایک کتاب اللہ سے غفلت اور دوسری قرآنِ پاک کی غلط تفسیر، فرماتے ہیں کہ مُسلمانوں کی اکثریت قرآن کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ صرف ایک دو فیصدی آدمی قرآن کی طرف توجہ دیتے ہیں وگرنہ غالب اکثریت غفلت کا شکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں کو اتنی عظیم کتاب عطا فرمائی ہے مگر یہ اس سے اغماض برت کر تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی تباہی کی دوسری وجہ غلط تفسیر بھی عام ہے۔ خود مسلمانوں میں سے کتنے

---

[1] ـــــــ [2] ـــــــ

نام نہاد مفسرین ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی تفسیر غلط کی ہے۔ عبداللہ چکڑالوی کا دماغ خراب ہوا اور اُس نے غلط تفسیر کر کے لوگوں کو گمراہ کیا۔ کبھی نمازوں کی تعداد دو بتائی اور کبھی تین بتائی۔ اس طرح سرسیّد کا دماغ بھی خراب ہوگیا۔ اُس نے بڑے اچھے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی مگر معجزات کا انکار کیا اور من مانی تفسیر کی۔ غلام احمد پرویز ابھی حال ہی میں فوت ہوا ہے اُس نے بھی قرآن کے نام پر دُنیا میں کفر پھیلایا۔ اہلِ بدعت کی غلط تفاسیر بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ قرآن کریم میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں اور لوگوں کو تباہ و برباد کیا ہے مودودی صاحب کی تفسیر میں بھی بہت سی اعتقادی غلطیاں ہیں۔ انہوں نے بھی حدیث کے سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں۔ اصلاحی صاحب ابھی زندہ سلامت ہیں انہوں نے واقعہ معراج کو خواب سے تعبیر کر دیا ہے۔ حالانکہ چھیالیس [۴۶] صحابہ سے یہ واقعہ تواتر کے ساتھ منقول ہے مگر انہوں نے اسے خواب کا واقعہ قرار دیا ہے۔ اگر یہ خواب کا واقعہ تھا تو پھر مشرک لوگ کس بات پر جھگڑا کرتے تھے خواب میں تو سب کچھ ممکن ہے اسی طرح احمد رضا خاں نے قرآن پاک کے الفاظ کے غلط ترجمے کیے ہیں اور اسطرح قرآن پاک میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آج بڑے اچھے اچھے تراجم بھی موجود ہیں جن میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ ہے جو آپ نے مالٹا جیل میں قلمبند کیا تھا۔ اللہ کی کتاب کا نہایت احتیاط سے ترجمہ کیا ہے یہ معیاری تراجم ہیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کا ترجمہ بھی ٹھیک ہے تاہم خود اہلِ حدیث علمائے نے تسلیم کیا ہے کہ اُن کی تفسیر میں بعض غلطیاں موجود ہیں مولانا مودودی نے بعض صحیح احادیث کا اس لیے انکار کر دیا ہے کہ یہ عقل کے خلاف ہیں حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[۱] کہ ہماری عقلیں ناقص ہیں اور نبی کی عقل کامل ہے۔ لہٰذا ہمیں صحیح حدیث کے انکار کی بجائے اپنی عقل کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہیئے۔ صحیح حدیث بہرحال قولِ مصطفٰے ہے خواہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ بہرحال تفسیر قرآن کے ضمن میں میں نے یہ چند باتیں عرض کر دی ہیں۔

---

[۱] حجۃ اللہ مقدمہ صہ ۲

قرآنِ کریم کا موضوع اور سُورۃ فاتحہ

ربطِ مضامین

قرآنِ پاک کی تفسیر کے سلسلے میں کل عرض کیا تھا کہ کسی سُورۃ آیت یا لفظ کی تشریح سب سے پہلے قرآن پاک میں تلاش کی جائیگی اگر وہاں نہ ملے تو پھر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اگر وہاں پر بھی مسئلہ کا حل نہ مل سکے تو پھر اقوالِ صحابہؓ میں دیکھا جائے گا۔ اگر پھر بھی تفسیر معلوم نہ ہو تو تابعین اور اُن کے بعد والے آئمہ مجتہدین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے مسائل میں اہل علم لوگ ہی غور وفکر کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں

حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسنؒ نے مالٹا جیل میں اسیری کے دوران قرآن پاک کا نہایت عمدہ ترجمہ لکھا ہے۔ اُس کے مقدمہ میں آپ نے شاہ عبد القادرؒ کے حوالے سے یہ بات بیان کی ہے[1] کہ قرآن پاک کے معنی بغیر سند کے معتبر نہیں جہاں پر جب کسی نے قرآن کریم کے کسی لفظ کا کوئی معنی کیا ہے تو اُس سے پوچھا جائے گا، کہ تم نے یہ معنی کہاں سے لیا ہے کسی کی ذاتی رائے کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا اس کام کے لیے تمام مفسرین کرام نے اپنی زندگیوں کے بیشتر حصے صرف کیے ہیں انہوں نے اساتذہ کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے اور کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے، تب جا کر انہیں تفسیر قرآن کا ملکہ حاصل ہوا ہے۔ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں تمام اسناد بیان کی ہیں اور آپ نے تفسیر کی شرائط بھی بیان کی ہیں اور جو تفسیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یا صحابہ کرامؓ یا آئمہ سے منقول ہے اُس کو

---

[1] مقدمہ قرآنِ کریم حضرت شیخ الہندؒ صدؔ

ذکر کیا ہے۔ اسی طرح امام ترمذی اور امام حاکم نے بھی باب التفسیر لکھا ہے۔ امام طحاویؒ نے بھی اپنی کتاب مشکل الآثار میں تفسیر کا باب ذکر کیا ہے۔ اب آج کے درس میں قرآن پاک کے موضوع اور قرآن پاک اور سورۃ فاتحہ کے کوائف کا ذکر ہو گا۔

قرآن کا موضوع

ہر کتاب کا کوئی نہ کوئی موضوع (SUBJECT) ہوتا ہے جس سے وہ بحث کرتی ہے، اسی طرح قرآن پاک کا بھی موضوع ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کا موضوع ہے انسانِ مکلف یعنی وہ بالغ انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور عطا کیا ہے اور وہ قانون کا پابند ہے۔ قانون کی پابندی اس لیے ضروری ہے۔ کہ کوئی انسان اس کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ قانون کی پابندی سے ہی انسان ذہنی، عقلی اور اخلاقی طور پر ترقی کر کے بالآخر حظیرۃ القدس اور جنت میں پہنچے گا۔ انسان کی ترقی دنیا میں تو جاری رہتی ہے بلکہ حضور علیہ السلام کی تعلیم[1] کے مطابق ایمان والے کی ترقی برزخ میں بھی جاری رہتی ہے اور پھر وہ حشر کی منزل کو طے کر کے اصل منزل تک پہنچے گا۔ تو بہر حال قرآن کا موضوع انسانِ مکلف ہے۔ قرآن پاک کسی خاص فردِ واحد سے نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان سے بحث کرتا ہے۔

عالمی اور قومی نبی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا مقصد بھی عالمی طور پر پوری انسانیت کی تکمیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اقوامِ عالم اور پوری بنی نوع انسان کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ قرآن میں اس بات کا اعلان خود حضور علیہ السلام کی زبان سے اس طرح کرایا گیا ہے۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف) اے بنی نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف رسول بن کر آیا ہوں۔ تو اس لحاظ سے آپ عالمی نبی ہیں، حضور علیہ السلام کی دوسری حیثیت قومی نبی کی ہے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صہ ۵۳/ ۱

کیونکہ قرآن پاک کا نزول قریش کی قومی زبان عربی میں ہوا۔ اس سے قریش کی سعادت بھی مقصود تھی۔ اصحاب فیل کے واقع میں اللہ تعالیٰ نے قریش کی بڑی عزت افزائی فرمائی اور ایک طاقتور دشمن کو چھوٹے چھوٹے سے جانوروں سے ذلیل کروا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسی قریش خاندان میں اپنے آخری نبی کو مبعوث فرمایا اور قرآن پاک بھی انہی کی زبان میں نازل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم) ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اُس کی قومی زبان میں۔ قرآن پاک کے متعلق اللہ نے فرمایا اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف) ہم نے قرآنِ حکیم کو عربی زبان میں نازل فرمایا تاکہ تم اس پروگرام کو اچھی طرح سمجھ سکو، تو اس لحاظ سے آپ قومی نبی بھی ہیں۔

اسلام کی عالمی حیثیت

بہرحال قرآن کا موضوع انسان مکلف ہے کیونکہ تکمیلِ انسانیت ہی اس کا مقصد ہے۔ نبوت کا مقصد بھی یہی ہے کہ اجتماعی طور پر تمام انسانیت کو ترقی نصیب ہو اور اسلام بھی عالمی ترقی کا ہی پروگرام پیش کرتا ہے جس کے ذریعے تمام عالمِ انسانیت کی ہدایت مطلوب ہے تو گویا مذہب اسلام بھی کسی خاص قوم اور خاص وطن کیلیے نہیں آیا بلکہ اقوام عالم کے لیے آیا ہے۔ اگرچہ یہ ایک خاص قوم اور خاص زبان میں نازل ہوا ہے مگر اس کی حیثیت عالمی ہے اور اس کی دعوت پوری بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ گذشتہ ادوار میں اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو ایک قوم کی طرف مبعوث کیا اور کسی کو دو یا زیادہ اقوام کی طرف مگر تمام اقوام عالم کے لیے صرف حضور علیہ السلام ہی کی ذاتِ مبارکہ کو مبعوث فرمایا ہے۔ ہاں حضور علیہ السلام کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی عمومی حیثیت میں نبی بنا کر بھیجا۔ آپ کی نبوّت و رسالت بھی تمام انسانوں کے لیے تھی۔ اور پھر سب سے آخر میں یہ منصب اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

کو عطا فرمایا۔

اصلاح علم وعمل

نزولِ قرآنِ پاک کا ایک مقصد یہ ہے کہ یہ علم اور عمل دونوں چیزوں کی اصلاح کرتا ہے۔ علم ایک عام چیز ہے اور اس میں بڑی خرابیاں پائی جاتی ہیں لوگوں کے عقیدے خراب ہوتے اور فکر میں بگاڑ پیدا ہوتا۔ باطل مذاہب والے لوگ بھی علم رکھتے ہیں، وہ کوئی جاہل مطلق نہیں ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں بڑے بڑے عالم موجود ہیں۔ اُن کے پاس دُنیاوی، مذہبی، کلچرل اور اجتماعی ہر قسم کے علوم ہیں مگر ان میں خرابی پائی جاتی ہے، وہ عالم ہیں مگر بگڑے ہوئے، تو قرآن پاک ہر بگڑے ہوئے علم کی اصلاح کر کے لوگوں کے عقیدے، فکر اور ذہن کی اصلاح کرتا ہے، یہ علم کی اصلاح ہے۔

اور عمل کا بگاڑ تو عام ہے۔ دنیا کی کوئی قوم عملی بگاڑ ——— سے خالی نہیں۔ ہم سچے دین کے پیروکار ہیں، مسلمان کہلاتے ہیں مگر ہم میں بھی عملی خرابیوں کی کمی نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحیح عمل بالکل ناپید ہو چکا ہے بلکہ صالح اعمال والے لوگ بھی کچھ نہ کچھ تعداد میں ہر زمانے میں موجود رہے ہیں اور موجود رہیں گے۔ حق باطل کبھی ختم نہیں ہوگا۔ بہر حال خرابی علمی ہو یا عملی یا اخلاقی قرآن پاک اس کی اصلاح کرتا ہے امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن کا مطلب حصول سعادت الدارین یعنی دونوں جہاں کی سعادت مندی حاصل کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کی علمی اور عملی اصلاح ہو جائے تو اُسے دُنیا میں بھی سعادت حاصل ہو جائے گی اور اُس کی آخرت بھی باسعادت ہو گی۔ غرضیکہ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا موضوع انسان مکلف ہے۔ یہ قرآن انسان کی علمی اور عملی دونوں طریقوں سے اصلاح کرتا ہے اور نبوت کا مقصد بھی جیسا کہ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں، تکمیل انسانیت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا جو لوگوں کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ پھر جو لوگ

انبیاء سے ادب سیکھ کر اُس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں وہ درجہ کمال تک پہنچ جاتے ہیں اور جو لوگ انبیاء کی تعلیم و تربیت سے مستفید نہیں ہوتے وہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات پر بدبختی کا شکار رہتے ہیں۔

کوائف قرآن

قرآنِ پاک کے موضوع کے ذکر کے بعد اب قرآن حکیم کے کچھ کوائف بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی کل ۱۱۴ سورتیں ہیں اور ہر سورۃ کو ایک صحیفہ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ سورۃ بینہ میں موجود ہے رَسُولٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اللہ کا رسُول پاکیزہ صحیفے پڑھ کر سناتا ہے اور اس سے مراد یہی سورتیں ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہر سورۃ کو علیحدہ علیحدہ صحیفہ تسلیم کر لیا جائے تو قرآن پاک کے کل ۱۱۴ صحیفے بن جائیں گے۔ ان میں سے بعض لمبے ہیں جیسے سورۃ بقرہ، آل عمران، مائدہ وغیرہ، بعض درمیانے درجے کے صحیفے ہیں اور بعض چھوٹے۔ ہر سورۃ یا صحیفے میں انسانیت کو درجہ کمال تک پہنچانے کا پروگرام موجود ہے۔ اگر انسان چھوٹی سے چھوٹی سورۃ میں بھی غور و فکر کرے، اس پر اعتقاد جمائے اور اس کے مطابق عمل کرے تو اس کے لیے یہی کافی ہے۔

قرآن پاک کی کل آیات کی تعداد چھ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ اس تعداد کے متعلق مفسرین میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ کوئی ایسا فاش اختلاف نہیں۔ بعض حضرات کسی ایک آیت کو دو شمار کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے کُل گنتی میں فرق آجاتا ہے جیسے سُورۃ الفجر کی ایک لحاظ سے تیس ۳۰ آیات ہیں جب کہ دوسرے حساب سے تینتیس ۳۳ ہیں۔ اس طرح کل آیات ۶۶۱۶ یا ۶۶۰۰ بنتی ہیں۔ اور اگر ہر سورۃ کے ساتھ بسم اللہ کو بھی آیت شمار کر لیا جائے تو مزید کچھ فرق پڑ جائے گا، وگرنہ سورۃ نمل کو چھوڑ کر باقی ۱۱۳ سُورتوں میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کسی سُورۃ کا جزو نہیں ہے۔

قرآن پاک کے جملہ الفاظ یا کلمات کی تعداد ۷۷،۹۳۴ ہے جب کہ جملہ حروف ۳۲۳،۷۶۰ ہیں۔ حضرت مجاہدؒ اور حضرت عطاؒ کی تعداد میں کچھ تھوڑا بہت فرق ہے، تاہم ابن کثیر[1] اور دیگر مفسرین نے مذکورہ تعداد کو ہی اختیار کیا ہے۔

اہل تشیع کی کذب بیانی

کُتب حدیث میں جس طرح اہل سُنّت کے ہاں صحاح ستہ اور پھر اُن میں صحیح بخاری کو شرف حاصل ہے۔ اسی طرح اہل تشیع کی چار معتبر کتابوں (اصول اربعہ) میں سے اصول کافی سب سے معتبر کتاب ہے۔ اس کا جامع تیسری اور چوتھی صدی کا یعقوب کلینی ہے۔ اُس نے اپنے راویوں سے روائتیں جمع کی ہیں اور انہیں امام جعفر صادقؒ اور حضرت علیؓ سے منسوب کر کے حضور علیہ السلام کے ساتھ وابستہ کیا ہے، تاہم اہل سنّت کی تحقیق کے مطابق ان میں سے اکثر روایات صحیح نہیں ہیں۔ بہر حال اصول کافی میں لکھا ہے[2]۔ اِنَّ الْقُرْاٰنَ الَّذِیْ جَآءَ بِہٖ جِبْرَئِیْلُ اِلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَۃَ عَشَرَ اَلْفَ اٰیَۃٍ یعنی جس قرآن پاک کو جبرائیل علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر لائے تھے اُس کی سترہ ہزار (۱۷۰۰۰) آیتیں تھیں۔ یہ روایت بالکل جھوٹ کا پلندہ ہے کیونکہ قرآن پاک کی آیات کی تعداد جیسا کہ پہلے عرض کیا چھ ہزار سے کچھ زائد ہے۔ شیعہ حضرات اس روایت سے گویا یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ باقی آئیتیں صحابہ کرامؓ نے قرآن پاک سے خارج کر دیں۔ اس روایت سے صحابہ کرامؓ کی دیانت کو مجروح کرنا مقصود ہے جنہوں نے قرآنِ پاک کی جملہ آیات کو جمع کیا، لکھوایا اور پھر آگے پھیلایا۔ یہ روایت حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔

سُورۃ فاتحہ کے کوائف و فضائل

قرآن پاک کی سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے جس کے مختلف نام بعد میں ذکر کیے

---

[1] ابن کثیر ص ۷ ج ۱

[2] اصول کافی ص ۶۳۴ ج ۲ مطبوعہ تہران ۱۳۸۸ھ

جائیں گے۔ سات آیات پر مشتمل اس سورۃ میں پچیس[۲۵] الفاظ اور ایک سو ئیس[۱۲۳] حروف ہیں۔

بعض روایات[۱] میں آتا ہے لُبَابُ الْقُرْاٰنِ الْحَوَامِیْمُ السَّبْعَۃُ یعنی پورے قرآن پاک کا لب لباب ان سات سورتوں میں ہے جن کی ابتدا حٰمٓ سے ہوتی ہے۔ قرآن پاک کے بنیادی مسائل توحید، رسالت، قیامت اور وحی الٰہی ہیں، باقی سب کچھ ان کی تشریح کے ضمن میں آتا ہے۔ تو یہ چار بنیادی چیزیں حوامیم میں کمال درجے کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔ اور پھر ان سات سورتوں کا خلاصہ صرف ایک سورۃ فاتحہ میں آگیا ہے۔ اور اس سورۃ کا نچوڑ اس کی آیت اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں سما گیا ہے۔ صرف اللہ کی عبادت اور اسی سے استعانت طلبی منتہائے کمال ہے اور یہ اس سورۃ فاتحہ کا خلاصہ ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد[۲] ہے کہ سورۃ فاتحہ اَعْظَمُ سُوْرَۃٍ فِی الْقُرْاٰنِ یعنی قرآن پاک میں سب سے اعظم، بہتر اور اچھی سورۃ یہی ہے۔ اعظم کا لغوی معنی بڑی ہے۔ مگر مراد یہ ہے کہ فضیلت میں سورۃ فاتحہ قرآن پاک کی سب سے بڑی سورۃ ہے۔ تمام بڑی، چھوٹی اور وسطانی سورتوں میں سب سے اعلیٰ مقام سورۃ فاتحہ کو حاصل ہے کیونکہ اس میں پورے قرآن کریم کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ بے مثال سورۃ ہے۔

مضامین سورۃ

قرآنِ پاک کے دو بنیادی مباحث ہیں، ایک عقائد کا اور دوسرا اعمال کا، اعمال شخصی بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہوتا ہے اور منزلی بھی جن کا تعلق تمدنی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ علم اخلاق والے اور حضرت امام شاہ ولی اللہؒ ان کو تدبیر منزل سے موسوم کہتے ہیں۔ ان میں وہ اعمال آتے ہیں جن کا تعلق محلے، شہر یا ملک سے ہوتا ہے اور ان کی ضرورت اجتماعی زندگی میں گھر کے اندر سے شروع ہو کر پورے معاشرے تک ہوتی ہے ان دونوں انواع کے اعمال کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ عقائد کے سلسلے میں توحید کا ذکر بطورِ خاص ہے، اس کے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۶۹ جلد ۴
[۲] بخاری صفحہ ۶۴۲ جلد ۲

علاوہ نبوّت و رسالت اور قیامت کا ذکر ہے جو کہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا بیان موجود ہے۔ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اچھے اور پسندیدہ اخلاق کو اختیار کرنے اور بُرے اور ناشائستہ اخلاق سے پرہیز کی تلقین ہے اہل ایمان کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہت بڑا اصول ہے جس کو قرآن پاک میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اہم مضامین میں نیکی کے کاموں میں تعاون، خیر و شر کی پہچان، قضا و قدر پر ایمان، سعادت و شقاوت کی پہچان، شفاعت کا مسئلہ، جنت اور دوزخ کی تفصیلات ہیں۔ معاشرتی مسائل میں نکاح و طلاق کے مسائل، وراثت، لین دین، بیع شرائع، خلافت، سیاست اور امورِ سلطنت وغیرہ سب قرآنِ کریم میں مذکور ہیں۔ شر و فساد کے قلع قمع کے لیے جہاد کی ضرورت اور فرضیت کا ذکر ہے۔ تبلیغ اسلام کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل) تبلیغ دین کا فریضہ نہایت دانائی اور اچھے طریقے سے آگے بڑھانا چاہیئے اور اگر اغیار کے ساتھ بحث مباحثہ کی نوبت آئے تو اخلاق کی حدود میں رہتے ہوئے احسن طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

قرآن پاک کے دیگر مضامین میں محبت، صبر، عزم، تقویٰ جیسے اہم اصول ہیں امام شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ کی حکمت کے مطابق چار اہم بنیادی اخلاق، طہارت، اخبات سماحت اور عدالت کا تذکرہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ یہ سب قرآن کریم کے اہم مقاصد ہیں۔ اور سُورۃ فاتحہ اِن تمام مقاصد پر مشتمل ہے۔ اِن کا خلاصہ اس سورۃ مبارکہ میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ اعظم سورۃ فی القرآن ہے۔

سُورۃ الفاتحہ ___ دیباچہ قرآن

سُورۃ الفاتحہ کی فضیلت کے متعلق کل عرض کیا تھا کہ باعتبار درجہ اور فضیلت یہ قرآنِ پاک کی سب سے افضل اور پسندیدہ سورۃ ہے کیونکہ اس میں قرآن پاک کے تمام مقاصد کا خلاصہ آگیا ہے۔ ہر کتاب کی ابتدا میں اُس کتاب کا اجمالی تعارف دیباچہ کی صورت میں ہوتا ہے، چنانچہ قرآن پاک کا دیباچہ سُورۃ الفاتحہ ہے، کیونکہ یہ سورۃ قرآن پاک کے تمام معانی کی جامع ہے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی گئی ہے کَمِرْآۃٍ صَغِیْرَۃٍ تُرِیْکَ شَیْئًا عَظِیْمًا جس طرح ایک چھوٹا سا آئینہ بہت بڑی چیز کو دکھا دیتا ہے۔ اِسی طرح یہ مختصر سورۃ قرآنِ کریم کے تمام بڑے بڑے مضامین کی جھلک دکھاتی ہے۔

صفاتِ ربوبیت وعبدیت

اس سُورۃ مبارکہ میں پانچ صفات ربوبیت کی اور پانچ صفات عبدیت کی بیان کی گئی ہیں۔ ربوبیت کی پہلی صفت اسمِ ذات اللہ ہے اس کا ذکر سب سے پہلے ہوا ہے۔ دوسرے نمبر پر صفت رب ہے جس کا معنیٰ پرورش کر کے کسی چیز کو حدِ کمال تک پہنچانا ہے۔ خود انسان کی پرورش اور ہر چیز کا ارتقاء اِسی صفت رب کا مرہونِ منت ہے۔ تیسری صفت رحمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہر ایک کو ہمیشہ شامل حال رہتی ہے۔ چوتھی صفت رحیم یعنی خاص مہربانی ہے جو آخرت میں اُس کے فرمانبردار بندوں کو نصیب ہوگی۔ اس کے بعد پانچویں صفت مالک بیان ہوئی ہے کہ ہر چیز کا مالک خداوند کریم ہی ہے۔

اِس سُورۃ مبارکہ میں عبودیت کی پانچ صفات بھی بیان ہوئی ہیں۔ پہلی صفت عبادت

ہے۔ ہر انسان کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کے سامنے سرِ نیاز خم کر دے۔ دوسری صفت استعانت بیان ہوئی ہے۔ مخلوق کے لیے ہر دینی یا دنیاوی کام میں استعانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا انسان اللہ تعالیٰ کی استعانت کے محتاج ہیں۔ عبودیت کی تیسری صفت طلبِ ہدایت ہے۔ یہ بھی ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے ورنہ وہ کامیابی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ ہر اہلِ ایمان ہر نماز میں یہی دُعا کرتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اے اللہ! میری سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرما۔ پھر عبودیت کی چوتھی صفت طلبِ استقامت ہے۔ راہِ راست میسّر آجانے کے باوجود جب تک اس پر استقامت نصیب نہ ہو، انسان منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہر انسان کے لیے ایمان، توحید، صحیح عمل اور اخلاق پر قائم رہنا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس سُورۃ مبارک میں استقامت کو بھی طلب کیا گیا جو کہ بہت بلند چیز ہے۔ اس کے بعد عبودیت کی پانچویں صفت نعمت کا طلب کرنا اور خدا تعالیٰ کے غضب و ناراضگی سے پناہ چاہنا ہے۔ یہ تمام پانچوں صفات عبودیت بھی سورۃ فاتحہ میں بیان ہوگئی ہیں

انسانی جسم کے عناصر

امام رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) سلطان محمد غوری کے زمانے میں عظیم مفسّرِ قرآن ہوئے ہیں۔ اس وقت تک مسلمان عروج پر تھے کیونکہ اُن کا زوال تو ساتویں ہجری میں شروع ہوا ہے۔ تو امام صاحبؒ فرماتے ہیں[1] کہ انسان کی ساخت مختلف چیزوں کا مرکب ہے۔ اس جسم میں کثیف چیزیں بھی ہیں اور لطیف بھی۔ انسانی جسم کی ساخت میں خارجی دُنیا کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ جس طرح سونا چاندی، لوہا، ریت، چونہ زمین کے عناصر ہیں اسی طرح یہ اشیاء انسانی جسم کے عناصر بھی ہیں۔ یونانیوں کے زمانے میں چار عناصر تسلیم کیے

---

[1] تفسیر کبیر صـ ۲۲۹ ج ۱

جاتے تھے جو پانچ، چھ اور سات تک پہنچ گئے۔ ہندوستانیوں کے ہاں چھ عناصر مشہور تھے مگر اس میں کوئی تحدید نہ تھی۔ بعد میں جوں جوں سائنس نے ترقی کی اور تحقیقات کا دور آیا تو معلوم ہوا کہ کائنات میں عناصر کی تعداد تو کہیں زیادہ ہے، چنانچہ آج کل سائنسدانوں میں ایک سو بیس ۱۲۰ سے زیادہ عناصر کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اِن تمام عناصر سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور یہ سارے کے سارے انسانی جسم کا بھی حصہ ہیں۔ انسان کا جسم اللہ تعالیٰ نے نہایت پیچیدہ (COMPLICATED) کمپلی کیٹڈ بنایا ہے۔ بیشمار ظاہری اشیاء کے علاوہ اس میں لاتعداد باطنی لطیف چیزیں بھی ہیں۔

نفسِ شیطانی بہیمی اور ملکی

امام رازیؒ سمجھانے کی غرض سے فرماتے ہیں کہ انسانی جسم میں نفس شیطانی بھی پایا جاتا ہے اور نفس سبعی (درندوں جیسا) بھی۔ اس میں نفس بہیمی بھی ہے اور جوہر ملکی (فرشتوں جیسا) بھی۔ فرماتے ہیں کہ جوہر ملکی کا اطمینان اسم اللہ کی تجلی سے ہوتا ہے۔ جب انسان پر اسم ذات کی تجلی پڑتی ہے تو انسان میں موجود ملکی جوہر کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور جب اسم رب کی تجلی پڑتی ہے تو انسان کا نفس شیطانی زیر ہوتا ہے اور وہ انسانی ذہن میں شر و فساد برپا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب اسم رحمان کی تجلی وارد ہوتی ہے تو انسان کا نفس سبعی مغلوب ہوتا ہے اور اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ آج ساری کی ساری بادشاہی حق تعالیٰ کے لیے ہے جو نہایت مہربان ہے۔ پھر جب اسم رحیم کی تجلی انسان پر پڑتی ہے، تو اُس کے نفس بہیمی کی اصلاح ہوتی ہے۔ گویا ہر اسم پاک کی الگ الگ تجلی اور الگ الگ خواص ہیں۔ انسان کا جسم کثیف ہے اور یہ کثافت صفتِ مالکیت سے مغلوب ہوتی ہے اور انسان میں لطافت پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں پانچ صفات ربوبیت کی ذکر کی ہیں اور پانچ ہی عبودیت کی۔ اور اللہ کے پانچ اسمائے پاک کی تجلی سے مختلف قسم کے اثرات انسانی وجود پر

پیدا ہوتے ہیں۔

ملکیت اور بہیمیت کی کش مکش

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق[1] انسان میں ملکیت اور بہیمیت کی کشمکش جاری ہے اور ابدالآباد تک جاری رہیگی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت میں یہ دونوں مادے اس مقدار میں رکھ دیئے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے جب بھی ان میں سے کوئی مادہ ختم ہوگا۔ تو انسان باقی نہیں رہے گا۔ بہیمیت کا کچھ مادہ انسان کے ساتھ جنت میں بھی موجود ہوگا، کیونکہ انسانیت کے قیام کا انحصار اسی پر ہے۔ جب بہیمیت کی صفت کسی انسان میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس میں درندوں جیسی چیرنے پھاڑنے کی خصلت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیئے تعلیم یہ دی جاتی ہے کہ ایسے امور انجام دو جن سے بہیمیت مغلوب اور ملکیت غالب ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لیئے طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت جیسے زریں اصول اپنانا ہوں گے، ان امور کو انجام دینے سے بہیمیت دبی رہے گی اور کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اگر طہارت کی بجائے نجاست، عاجزی کی بجائے تکبر خدمت کی بجائے خود غرضی اور عدالت کی بجائے ظلم کو اختیار کرو گے تو بہیمیت بڑھ جائے گی اور انسان ناکامی کی منزل پر گامزن ہو جائے گا۔

خلاصہ کتب آسمانی

امام مجدد الف ثانیؒ[2] نے یہ بات حضرت علیؓ کی طرف منسوب کر کے اپنے مکاتیب میں نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی آسمانی صحیفے نازل فرمائے ہیں۔ ان کے تمام مضامین اولاً تین آسمانی کتابوں زبور، تورات اور انجیل میں جمع کر دیئے۔ پھر ان تینوں کتب کے جملہ مضامین کو قرآن پاک میں جمع فرمایا اور قرآن پاک کے تمام مضامین سورۃ فاتحہ میں یک جا کر دیئے، گویا دیباچہ قرآن سورۃ الفاتحہ میں وحی الٰہی کے تمام مضامین کا خلاصہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل، باب حقیقۃ الروح ص ۱۹ [2] تفسیر عزیزی ص ۱۷ ج ۱، مواہب الرحمٰن ص ۲۹ ج ۱

آگیا ہے۔ اور پھر سورۃ فاتحہ کے تمام مضامین بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں آگئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہمعصر شیخ عبدالکریم جیلیؒ مفسرِ قرآن نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر میں "اَلْکَھْفُ وَالرَّقِیْمُ فِیْ تَفْسِیْرِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں بسم اللہ کی تفسیر شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہے۔ اسی طرح صاحبِ تفسیر کبیر امام رازیؒ نے بھی بسم اللہ کی تفسیر میں فل سکیپ کے ستر صفحات لکھے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے تمام مضامین حرف "ب" میں آگئے ہیں بلکہ "ب" کے نقطہ میں ہیں، اور علمِ ریاضی میں نقطہ ایک ایسی چیز ہے جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی، اس کو فرض کیا جاتا ہے۔ لیکن اعداد کی تمام عمارت اسی نقطہ پر قائم ہے۔ اگرچہ نقطہ خود نظر نہیں آتا، اسی طرح ذاتِ خداوندی خود تو نظر نہیں آتی مگر تمام کائنات کی بنیاد اسی سے قائم ہے۔

اور "ب" کا مطلب استعانت بھی ہوتا ہے اور استعانت کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہی ہونی چاہیئے اور ہر کام کے لیے اُسی سے مدد طلب کرنی چاہیئے قرآن و سنّت میں اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ کا حکم موجود ہے کہ تمام مشکلات اور حوائج میں اللہ ہی سے مدد طلب کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق شاملِ حال نہ ہو تو انسان قدم بھی نہیں اٹھا سکتا حتیٰ کہ آنکھ بھی نہیں جھپک سکتا، وہ اور کیا کام انجام دے گا۔ لہٰذا استعانت بھی اللہ ہی سے کرنی چاہیئے۔ غرضیکہ توحید باری تعالیٰ جو پورے دین کی جڑ بنیاد ہے، اِسی نقطہ سے سمجھائی گئی ہے۔

امام جعفر صادقؒ سے منقول ہے کہ "ب" کا معنی ہے بِیْ کَانَ مَا کَانَ وَبِیْ یَکُوْنُ مَا یَکُوْنُ یعنی جو کچھ ہے میری وجہ سے اور جو

---

[1] الکھف والرقیم

کچھ ہوگا وہ میری وجہ سے ہوگا۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر اور اسکی فضیلت کے متعلق چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں۔

اب حدیث پاک میں سُورۃ فاتحہ کے جو مختلف نام آئے ہیں اُن کا ذکر کیا جائیگا۔

اسمائے سُورۃ الفاتحہ

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ سُورۃ فاتحہ قرآن پاک کا دیباچہ ہے، اور اس میں قرآن کریم کی مفصل تعلیمات کو نہایت اختصار کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ یہ سُورۃ قرآن کریم کی تمام سُورتوں میں سے افضل اور بہتر سُورۃ ہے۔ اب آج کے درس میں سورۃ فاتحہ کے اُن مختلف اسماء کا ذکر ہو گا۔ جو احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ فاتحۃ الکتاب

اِس سُورۃ مبارکہ کا پہلا نام[۱] فَاتِحَۃُ الْکِتٰبِ۔ فاتحہ کے معنی کھولنے والی ہے۔ اس کا معنیٰ ابتدا کرنے والی سورۃ بھی ہے، چنانچہ قرآنِ پاک کی ابتداء اسی سُورۃ سے ہوتی ہے۔ ہر مطبوعہ قرآنِ کریم کی ابتدا میں۔ یہی سُورۃ آتی ہے۔ اس واسطے اُس کو سورۃ فاتحہ کہا جاتا ہے۔ تعلیم دیتے وقت بھی سب سے پہلے اسی سُورۃ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جب نماز میں قرآن حکیم کی قرأت شروع کی جاتی ہے۔ تو وہ بھی اسی سُورۃ سے ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ مسئلہ ہے کہ اگر نماز میں سُورۃ فاتحہ سے پہلے کوئی دوسری سُورۃ پڑھی جائے تو سجدہ سہو لازم آتا ہے۔

۲۔ سورۃ الحمد

اِس سُورۃ مبارکہ کا دوسرا نام[۲] سُوْرَۃُ الْحَمْد ہے۔ حمد تعریف کو کہتے ہیں اور مراد ایسی سُورۃ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے اس کا نام سورۃ الحمد بھی ہے۔

۳۔ ام القرآن

اس سُورۃ کا تیسرا نام[۳] ام القرآن ہے۔ ام اصل کو کہتے ہیں ——— گویا قرآنِ پاک کی اصل یہی سورۃ ہے۔ قرآنِ پاک کی تمام تعلیمات جن کا تعلق

۱۔ تفسیر روح المعانی ص ۳۴ ج ۱، ۲۔ تفسیر ابن کثیر ص ۸ ج ۱، ۳۔ ترمذی ص ۱۱۵ ج ۱

اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے یا اُس کی صفات سے یا عالمِ بالا سے وہ سب اس سُورۃ مبارکہ میں مذکور ہیں۔ اس میں قیامت اور معاد کا ذکر موجود ہے۔ نبوت و رسالت کا ذکر ہے۔ اللہ کی صفت قضا و قدر بھی بیان ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ ام القرآن ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ تمام علوم کی غایت یا تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی پہچان ہے یا انسان کی عبودیت کی پہچان ہے۔ چونکہ یہ دونوں چیزیں اس سُورۃ میں پائی جاتی ہیں، اس لیے بھی اسے ام القرآن کہا جاتا ہے۔ تمام اصول اور فروعات جن کے انسان پابند ہیں یا جن سے انسان کے ظاہر و باطن کا تزکیہ مقصود ہے، وہ تمام کے تمام اس سُورۃ میں آ گئے ہیں، اس لیے بھی اس سُورۃ کو ام القرآن کہا گیا ہے۔

۴۔ سبع مثانی

اِس کا چوتھا نام[1] سَبۡعَ مَثَانِیۡ یعنی سات دہرائی ہوئی آیتیں ہیں۔ قرآن پاک میں اِس کو قرآنِ عظیم بھی کہا گیا ہے۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ (الحجر) ہم نے آپ کو سبع مثانی اور قرآنِ عظیم عطا فرمایا۔ اس سورۃ کا آدھا حصہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے اور آدھا حصہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش، ہدایت، استعانت، نیکی کی توفیق، گمراہی سے بچاؤ اور قہر و غضب سے نجات پر مشتمل ہے۔ مثانی کا معنیٰ دہرائی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ سورۃ ہر نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے۔ اس لیے بھی اسکو سبع مثانی کہا جاتا ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابُوہریرہؓ سے روایت[2] ہے وَالَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیَدِہٖ مَا اُنۡزِلَ فِی التَّوۡرٰۃِ وَلَا فِی الۡاِنۡجِیۡلِ وَلَا فِی الزَّبُوۡرِ وَلَا فِی الۡقُرۡاٰنِ مِثۡلُھَا اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے باعتبار درجہ، فضیلت، بہتری اور خیریت چاروں آسمانی کتابوں تورات، انجیل، زبور اور قرآن میں اس جیسی کوئی سورۃ نازل نہیں کی گئی۔ وَاِنَّھَا سَبۡعٌ مِّنَ الۡمَثَانِیۡ

---

[1] ترمذی ص ۱۱۵/۲   [2] ترمذی ص ۱۱۵/۲

یہ صرف سبع مثانی ہی ہے جو مجھے عطا کی گئی ہے۔

۵۔ وافیہ — اس سورۃ کا پانچواں نام اَلْوَافِیَۃُ[1] یعنی پورا کرنے والی ہے۔ چونکہ یہ سورۃ ہر مقصد کو پورا کرتی ہے، لہٰذا اسے وافیہ کہا گیا ہے۔ مقصود اصلاحِ عقائد ہو یا اعمال یا اخلاق یہ سورۃ سب کو پورا کرتی ہے اس لیے اس کا نامہ وافیہ ہے۔

۶۔ کافیہ — اس سورۃ مبارکہ کا چھٹا نام[2] سُوْرَۃُ الْکَافِیَۃِ ہے۔ کافیہ کا معنی کفایت کرنے والی ہے۔ انسان کی نجات کے لیے اگر اور کچھ بھی نہ ہو تو صرف یہی سُورۃ کفایت کر جائے گی، اس لیے اس کا نام سورۃ کافیہ رکھا گیا ہے۔

۷۔ اساس — اس کا ساتواں نام[3] سُوْرَۃُ الْاَسَاسِ ہے۔ اساس کا معنی بنیاد ہوتا ہے۔ ہر چیز کی بنیاد یہی سورۃ ہے۔ معاملہ تعلیم کا ہو یا عقیدہ کا۔ ظاہری اصلاح مطلوب ہو یا باطنی اصول ہوں یا فروعات ہر چیز کی بنیاد ہے، لہٰذا اسے سورۃ اساس بھی کہا گیا ہے۔

۸۔ شفا — اس سُورۃ کا آٹھواں نام[4] شفا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے باطنی شفا تو پورے قرآن پاک میں رکھی ہے۔ سُورۃ یُونس میں موجود ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے آگئی ہے موعظت وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ اور دِلوں کی بیماریوں کی شفا ہے چنانچہ قرآن پاک کو پڑھنے اور اس پر عمل کرنے سے تمام باطنی بیماریوں کفر، شرک، نفاق، بداخلاقی وغیرہ سے شفا ملتی ہے،

تاہم سورۃ فاتحہ میں بالخصوص باطنی بیماریوں کے علاوہ بعض ظاہری بیماریاں کے لیے بھی شفا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[5] شفاءٌ مِّنْ سمٍّ سُورۃ فاتحہ میں زہر کے لیے شفا ہے۔ اس کو پڑھ کر دم کیا جائے تو اللہ تعالیٰ شفا عطا کرے گا۔

۱؎ تفسیر روح المعانی ص ۳۸ ج ۱ — ۲؎ تفسیر ابن کثیر ص ۸ ج ۱

۳؎ تفسیر ابن کثیر ص ۸ ج ۱ — ۴؎ دارمی ص ۳۲ ج ۲ — ۵؎ تفسیر ابن کثیر ص ۸ ج ۱

دارمی شریف[۱] کی روایت میں یہ بھی آتا ہے فَاتِحَۃُ الْکِتٰبِ شِفَآءٌ مِّنْ کُلِّ دَآءٍ سورۃ فاتحہ میں ہر بیماری کی شفا ہے۔ اس طرح مسند بزار[۲] میں یہ روایت بھی موجود ہے اِذَا وَضَعْتَ جَنْبَکَ عَلَی الْفِرَاشِ جب تم لیٹنے کے لیے اپنا پہلو بستر پر رکھ دو وَقَرَأْتَ فَاتِحَۃَ الْکِتٰبِ وَقُلْ ھُوَ اللّٰہُ اور سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کی تلاوت کرو فَقَدْ اٰمِنْتَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ اِلَّا الْمَوْتَ تو تمہیں موت کے سوا ہر چیز سے امن حاصل ہو گیا۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے[۳] کہ ایک شخص کو دوران سفر بچھو نے کاٹ لیا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا تو اس شخص کو شفا حاصل ہو گئی۔ مریض سردار آدمی تھا، اس نے کچھ معاوضہ بھی ادا کیا جو حضرت ابو سعیدؓ نے قبول کر لیا۔ واپس آکر حضور علیہ السلام کی خدمت میں سارا واقعہ کہ سنایا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ علاج والی سورۃ ہے، لہٰذا اس کے ساتھ علاج کے لیے اگر کوئی معاوضہ دے تو لے سکتے ہو۔ اس میں کوئی حرج نہیں، نیز آپ نے یہ بھی فرمایا مَا یُدْرِیْکَ اَنَّھَا رُقْیَۃٌ تجھے کیا معلوم کہ یہ سورۃ یہ کام بھی کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے کبھی سورۃ فاتحہ کی یہ تعریف سنی ہو اور پھر عقیدت کے ساتھ دم کیا تو شفا مل گئی۔

۹۔ تعلیم المسئلہ

سورۃ فاتحہ کا نواں[۴] نام تعلیم المسئلہ ہے۔ اس میں سوال کرنے کا طریقہ سکھلایا گیا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ سے کوئی حاجت طلب کرنا ہو تو پہلے اس کی حمد و ثنا بیان کرو اور اس کے بعد اپنا سوال پیش کرو۔ لہٰذا یہ سورۃ تعلیم المسئلہ بھی ہے۔

۱۰۔ شکر

اس سورۃ کا دسواں[۵] نام شکر ہے۔ جب کوئی شخص کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ

۱؎ دارمی ص ۴۲۰ ج ۲ ۔ ۲؎ در منثور ص ۵ ج ۱

۳؎ بخاری ص ۸۵۶ ج ۲ ۔ ۴؎ تفسیر روح المعانی ص ۳۸ ج ۱ ۔ ۵؎ تفسیر روح المعانی ص ۳۸ ج ۱

الْعٰلَمِیْنَ تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمانِ مبارک ہے کہ جب بھی کوئی نعمت ملے یا کسی نعمت کو استعمال میں لاؤ تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے مختلف مواقع پر شکر ادا کرنے کی دعائیں سکھلائی ہیں مثلاً جب کھانا کھاچکو تو اس طرح کہو[1] اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ شکر ہے اُس اللہ تعالیٰ کا جس نے مجھے کھلایا اور پلایا اور مسلمانوں میں بنایا۔ جب کوئی شخص نیا کپڑا پہنے تو یوں[2] کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے کپڑا پہنایا۔ جب کسی سواری پر سوار ہوں تو یہ دُعا کریں[3]۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور پاک ہے وہ ذات جس نے اِس سواری کو ہمارے تابع کر دیا۔ بہر حال یہ الحمد للہ شکر کا معنیٰ بھی دیتا ہے۔ اس لیے اس سُورۃ کا ایک نام شکر بھی ہے۔

۱۱۔ دُعا

اس سُورۃ کا گیارہواں نام سورۃ دُعا بھی[4] ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے اور اس کے لیے عبودیت اور استعانت کا اقرار کرنے کے بعد اپنی حاجت کا سوال بھی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا بلاشبہ یہ سورۃ دُعا بھی ہے۔

۱۲۔ رقیہ

اس سُورۃ کا بارہواں نام سورۃ رقیہ یعنی[5] جھاڑ پھونک والی سورۃ ہے۔ اس کو پڑھ کر مریض پر دم کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ شفا بخشتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابُو سعید خدریؓ نے اس سورۃ کے ساتھ دم کیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تجھے کیا پتہ کہ یہ سُورۃ جھاڑ پھونک کا کام بھی دیتی ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ نے زہر یا دیگر مضر اشیاء کے لیے شفا رکھی ہے۔ بہر حال اس کا ایک نام رقیہ بھی ہے۔

---

[1] ترمذی ص ۱۸۴/ج ۲ [2] ترمذی ص ۱۹۶/ج ۲

[3] ترمذی ص ۱۸۲/ج ۲ ، [4] تفسیر روح المعانی ص ۳۸/ج ۱ [5] تفسیر روح المعانی ص ۳۸/ج ۱

۱۳- واقیہ اس کا تیرہواں نام[1] واقیہ یعنی بچانے والی سورۃ ہے۔ جو شخص اس پر ایمان لائے گا اور اس کی تلاوت کریگا۔ وہ دنیا اور آخرت کے شرور وفتن سے بچ جائے گا

۱۴- کنز اِس سورۃ کا چودھواں نام[2] الکنز ہے۔ کنز کا معنی خزانہ ہوتا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[3] ہے اُعْطِیْتُ مِنْ خَزَائِنِ الْعَرْشِ مجھے عرش کے خزانوں میں سے خزانہ عطا کیا گیا ہے۔ اس خزانہ میں ایک تو یہ سورۃ فاتحہ ہے اور دوسری آیت الکرسی ہے اور تیسری چیز بقرہ کی آخری آیات ہیں۔ طبرانی کی روایت میں سورۃ کوثر کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس کے علاوہ[4] لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کے متعلق بھی آتا ہے کہ یہ عرش کے خزانوں میں سے خزانہ ہے۔ اس کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ بکثرت پڑھا جائے۔

۱۵ سورۃ الصلوٰۃ اِس سورۃ کا پندرہواں نام سورۃ الصلوٰۃ ہے۔ چونکہ یہ سورۃ نماز کے لیے مخصوص ہے اور ہر نماز خواہ فرض ہو یا نفل، اس میں سورۃ فاتحہ پڑھنا پڑتی ہے لہٰذا اِس کو سورۃ الصلوٰۃ بھی کہا جاتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ اور میرے بندے کے لیے وہی ہوگا جو مانگے گا۔ فرمایا جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی۔ جس وقت بندہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ فرماتا ہے اَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ میرے بندے نے میری ثنا بیان کی۔ پھر جس وقت بندہ کہتا ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص $\frac{8}{1}$
[2] روح المعانی ص $\frac{38}{1}$
[3] تفسیر ابن کثیر ص $\frac{34}{1}$
[4] ترمذی ص $\frac{184}{1}$

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ فرماتا ہے مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ میرے بندہ نے میری بزرگی کا اظہار کیا ہے اور میری عظمت بیان کی ہے۔ اُس نے اپنے معاملات میری طرف سونپ دیئے ہیں۔ اس کے بعد جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِیْ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ ایک کام میں کرتا ہوں اور ایک بندہ کرتا ہے جب بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ هٰذَا لِعَبْدِیْ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور بندہ جو مانگتا ہے، میں اس کو دیتا ہوں۔

صراطِ مستقیم سے مراد انعام یافتہ لوگوں کا رستہ ہے جن میں نبی، صدیق، شہید اور صالحین شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اِن لوگوں کے طریقے پہ چلنے کی دُعا کی جاتی ہے نہ کہ اُن لوگوں کا راستہ جن پہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا یعنی یہودی اور نہ گمراہوں یعنی نصارےٰ کا راستہ۔ یہ لوگ توحید اور ایمان کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ لہذا ان کے راستے سے پناہ مانگی گئی ہے۔ جو بھی فرد یا قوم ابنیت کے عقیدے کو اپنائے گی، یا خدا تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک بنائیگی، وہ گمراہ ہوگی۔

جب بندہ یہ الفاظ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلوبہ چیز کے عطا کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ نسائی شریف[1] کے ہیں۔ البتہ بعض الفاظ کی کمی بیشی سے بخاری اور مسلم[2] شریف میں بھی ہیں۔ حدیث کی تمام کتابوں میں سورۃ فاتحہ کو سورۃ الصلوٰۃ کا نام دیا گیا ہے۔ اسمائے سورۃ کے بیان کے بعد اب نماز میں سورۃ فاتحہ

---

[1] نسائی صفحہ ۱۴۵ ج ۱ [2] مسلم صفحہ ۱۷۰ ج ۱

کا حکم عرض کیا جائے گا۔

نماز میں سورۃ فاتحہ کا حکم

کل سُورۃ فاتحہ کے وہ نام عرض کیے تھے جو مختلف احادیث میں آئے ہیں سُورۃ فاتحہ کو نماز کے ساتھ خاص تعلق ہے، اسی لیے اس کا ایک نام سورۃ الصلوٰۃ بھی ہے۔ آج کے درس میں سورۃ فاتحہ کو نماز میں پڑھنے کے حکم سے متعلق مختصر طور پر عرض کیا جاتا ہے۔

ارکانِ نماز

نماز میں بعض ارکان یا فرائض ہیں، بعض سنن اور بعض مستحبات ہیں۔ اگر نماز میں کوئی فرض ترک ہو جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے اُس کو لوٹانا پڑتا ہے تکبیر تحریمہ فرائض میں شامل ہے، بعض اس کو شرط کہتے ہیں، تاہم اس کے لازم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، جب تک کوئی شخص تکبیر تحریمہ نہیں کہے گا، نماز میں داخل نہیں ہو سکتا۔ نماز میں قرأت کرنا بھی فرض ہے۔ قرآن پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی، رکوع، سجود بقدر استطاعت قیام اور آخری قعدہ یہ سب ارکانِ صلوٰۃ ہیں۔ آخری قعدہ کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف ہے۔ امام ابُو حنیفہؒ اس کو رُکن قرار دیتے ہیں[1] مگر بعض دیگر آئمہ اِس رُکن کو تسلیم نہیں کرتے مگر اس کے ضروری ہونے کے وہ بھی قائل ہیں۔ اسی طرح قرأت یعنی قرآن پاک کی تلاوت بھی نماز کا رُکن ہے۔ قرأت کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ فرض نماز کی دونوں رکعتوں میں قرأت فرض ہے اور اگر نماز تین یا چار رکعت والی ہے تو اس کی پہلی دو رکعتوں میں قرأت فرض ہے۔ وتر، سنن

---

[1] ہدایہ ص۶۳ ج۱، شرح نقایہ ص۶۹ ج۱

مطلق قرأۃ فرض ہے

یا نوافل کی ہر رکعت میں قرأت ضروری ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا۔ قرأت سے مراد قرآنِ کریم کا پڑھنا ہے۔ اب اس مسئلہ میں آئمہ کرام کا اختلاف ہے کہ آیا مطلق قرأت فرض ہے یا سورۃ فاتحہ بھی فرض ہے امام ابُوحنیفہؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور امام ابُوحنیفہؒ کے تمام شاگرد کہتے ہیں۔ کہ نماز میں مطلق قرأت فرض ہے[1]۔ قرآنِ پاک کا کوئی بھی حصہ نماز میں پڑھ لیا جائے تو فرض ادا ہو جائے گا اس میں سورۃ فاتحہ کی تخصیص نہیں ہے اُن کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سُورۃ مزمل میں فرمایا ہے۔ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ قرآن میں سے جو حصہ بھی میسّر ہو، پڑھو یعنی جتنا یاد ہو یا جتنا ممکن ہو، پڑھ لو تو نماز ہو جائے گی۔ سُورۃ فاتحہ ہو یا قرآن کریم کا کوئی حصہ ہو، اس کے پڑھنے سے نماز ادا ہو جائیگی۔ قرآن سے یہی بات ثابت ہے۔

سورۃ فاتحہ واجب ہے

البتہ ترمذی شریف اور موطا امام مالک میں حضرت ابُوہریرہؓ سے یہ روایت منقول ہے[2] کہ جس نماز میں سُورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے فَهِيَ خِدَاجٌ غَيْرُ تَمَامٍ وہ نماز ناقص ہے اور نامکمل ہے۔ اِسی لیے امام ابُوحنیفہؒ اور بعض دیگر آئمہ فرماتے ہیں کہ مطلق قرأت تو فرض ہے مگر سُورۃ فاتحہ واجب ہے۔ واجب سے مراد یہ ہے کہ اس کا درجہ فرض سے کچھ کم اور سنّت سے زیادہ ہے۔ اگر سُورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز باطل تو نہیں ہوگی مگر ناقص اور ناتمام ہوگی۔ سُورۃ فاتحہ کے ساتھ قرآن پاک میں سے کم از کم ایک لمبی آیت یا تین چھوٹی آیتیں یا اس سے زیادہ ملانا بھی واجب ہے اگر کوئی شخص صرف سُورۃ فاتحہ پڑھتا ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسری سُورۃ نہیں ملاتا تو اس سے واجب ترک ہوتا ہے۔ اگر اس کا تدارک سجدہ سہو سے کرے گا تو نماز ادا ہو جائے گی، اِسی

---

[1] ہدایہ ص ۶۳ ج ۱، شرح نقایہ ص ۶۷ ج ۱ [2] مؤطا امام مالک ص ۶۷، ترمذی ص ۱۷ ج ۱

طرح اگر کوئی شخص فاتحہ نہیں پڑھتا بلکہ کوئی دوسری سورۃ پڑھ لیتا ہے تو یہ بھی ترکِ واجب ہوگا اور سجدہ سہو سے تلافی ہو سکے گی، غرضیکہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا اور اس کے ساتھ قرآن پاک کا کوئی دوسرا حصہ مِلانا واجب ہے، نہ کہ رُکن یا فرض۔ اس سلسلے میں صحاح ستہ[۱] میں بہت سی احادیث موجود ہیں۔

امام ابُوحنیفہؒ اور آپ کے تمام شاگرد کہتے ہیں کہ نمازی کی تین حالتیں ہیں اور ہر حالت کا حکم الگ ہے۔ نمازی کبھی منفرد ہوتا ہے یعنی اکیلا نماز پڑھتا، کبھی امام ہوتا ہے کہ دوسروں کو نماز پڑھاتا ہے اور کبھی مقتدی کی حیثیت میں امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے امام ابُوحنیفہؒ فرماتے ہیں، کہ جب کوئی شخص اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اس کے لیے سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ ملانا بھی ضروری ہے۔ جب کوئی شخص بطور امام نماز پڑھاتا ہے، تو وہ سورۃ فاتحہ بھی پڑھے گا اور اس کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ بھی ملائے گا۔ البتہ جب کوئی شخص مقتدی بن کر امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے تو اس کے ذمہ قرأت نہیں بلکہ اس کے لیے استماع اور انصات ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ امام کی قرأت کو سُنے گا۔ ایسا شخص نماز کے تمام آداب بجا لائیگا، تمام ارکان پورے کریگا مگر قرأت کرنا اس کے ذمے نہیں ہے۔ نمازی کی یہ تین حالتیں ہیں جنہیں آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

امام بخاری کا استدلال

امام بخاریؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت[۲] بیان کی ہے۔
لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ یعنی سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ یہ روایت نامکمل ہے۔ امام مسلمؒ نے آگے فَصَاعِدًا[۳] کا لفظ نقل کیا ہے جو کہ صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے اور اسے[۱] امام مسلم

---

[۱] مسلم صـ ۱۶۹ جـ ۱، ابن ماجہ صـ ۶۰، نسائی صـ ۱۴۵ جـ ۱، ابُوداؤد صـ ۱۱۸ جـ ۱ [۲] بخاری صـ ۱۰۴ جـ ۱، مسلم صـ ۱۶۹ جـ ۱

نے کے علاوہ نسائی اور ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔ اور پورا جملہ یوں ہے کہ اُس شخص کی نماز نہیں جو سورۃ فاتحہ اور کچھ زائد نہیں پڑھتا۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم منفرد نمازی کے لیے ہے۔ اگر اکیلا آدمی نماز پڑھتا ہے، تو اس کے لیے سورۃ فاتحہ اور کوئی دوسری سورۃ ملانا دونوں ضروری ہیں۔ ان کے بغیر نماز نہیں ہوگی مگر مقتدی کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ سورۃ فاتحہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، وہ باقی حصے کو کیوں ضروری قرار نہیں دیتے۔ لہٰذا یہ مطلق قرأت کا حکم ہے۔ اگر منفرد یا امام ہے، تو اس کو سورۃ فاتحہ اور کچھ زائد پڑھنا ہوگا، مگر مقتدی کا یہ حکم نہیں ہے اصل بات یہی ہے

محض قرأت کا حکم

نماز میں صرف قرأت سے متعلق بہت سی احادیث آئی ہیں۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں آتا ہے[1] اَمَرَنَا اَنْ نَّقْرَاَ فَاتِحَةَ الْكِتٰبِ وَمَا تَيَسَّرَ حضور علیہ السلام نے ہمیں حکم دیا کہ ہم سورۃ فاتحہ بھی پڑھیں اور جتنا حصہ میسّر ہو وہ بھی پڑھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے[1] اَمَرَنِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اُنَادِىَ اَنَّهٗ لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتٰبِ وَمَا زَادَ مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں اس بات کا اعلان کردوں کہ سورۃ فاتحہ اور کچھ زائد پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی، اسطرح ایک اور شخص کا واقعہ بھی حدیث میں آتا ہے[2]۔ حضور علیہ السلام خود مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک شخص آیا، اُس نے نماز پڑھی، پھر آکر حضور علیہ السلام کو سلام کیا، آپ نے فرمایا، جاؤ جاکر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اُس نے دوبارہ نماز پڑھی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے پھر کہا کہ جاؤ جاکر نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی۔ جب تیسری دفعہ بھی آپ نے ایسا ہی فرمایا تو اُس شخص نے عرض کیا کہ حضور! پھر آپ ہی بتائیں کہ میں کس طرح نماز پڑھوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے

---

[1] ابوداؤد ص ۱۱۸ ج ۱، ابن حبان ص ۲۱۱ ج ۳ [2] ابوداؤد ص ۱۱۸ ج ۱، مستدرک حاکم ص ۲۳۹ ج ۱ [3] ترمذی ص ۶۶ ج ۱

آؤ تو پہلے طہارت کرو، پھر قبلہ رو کھڑے ہو کر تکبیر کہو۔ پھر جو میسّر ہو قرآن پڑھو، پھر رکوع کرو سجدہ کرو اور پھر آخر میں قعدہ بیٹھ کر سلام پھیر دو۔ غرضیکہ آپ نے تعلیم کے طور پر فرمایا کہ جتنا میسّر ہو قرآن پڑھو۔ آپ نے سُورۃ فاتحہ کا ذِکر نہیں فرمایا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ سُورۃ فاتحہ کا پڑھنا نماز کا رُکن نہیں ہے۔ اسی لیے احناف کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں سُورۃ فاتحہ اور دوسری سُورۃ کا ملانا دونوں واجب ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ترک ہو جائے تو سجدہ سہو سے تلافی ہو جائیگی۔

فاتحہ خلف امام

اِسی طرح حضرت اَبُو موسیٰ اشعریؓ والی حدیث مسلم شریف[۱]، ابُوداؤد، نسائی، مسند احمد، ابن حبان وغیرہ تمام کُتب احادیث میں موجود ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو تکبیر کہو اور جس وقت امام قرأت کرے اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا تو تم خاموش رہو۔ یہ درجہ اوّل کی صحیح حدیث ہے۔ اس کے علاوہ مؤطا امام مالک کی یہ روایت بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۲] مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلٰوةِ، یعنی جس نے نماز میں رکوع کو پالیا، اُس نے نماز کو پالیا۔ رکعۃ کا معنیٰ رکعت بھی ہے اور صرف رکوع بھی۔ رکوع میں شامل ہونے سے نمازی سورۃ فاتحہ تو نہیں پڑھا مگر اُس کی رکعت شمار ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ مقتدی کے لیے لازم نہیں ہے بلکہ امام کی قرأت ہی اس کو کفایت کر جائیگی۔ اسی طریقے سے حضرت جابرؓ[۳] والی روایت، طحاوی شریف اور مؤطا امام محمد میں ہے۔ آپ نے فرمایا مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ یعنی جو امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو تو امام کی قرأت اس کی قرأت شمار ہوگی، لہٰذا اُسے خود قرأت کرنے کی ضرورت نہیں۔

۱؎ مسلم صـ ۱۷۴/ج۱، مسند احمد صـ ۴۱۵/ج۴، نسائی صـ ۱۴۶/ج۱، ابُوداؤد صـ ۸۹/ج۱ ۲؎ مؤطا امام مالک صـ ۷

۳؎ طحاوی صـ ۱۴۹/ج۱، ابن ماجہ صـ ۶۱، مسند احمد صـ ۳۳۹/ج۳، مصنف ابن ابی شیبہ صـ ۳۷۷/ج۱، مؤطا امام محمد صـ ۹۹

وہ خاموش کھڑا رہے۔

ترمذی شریف[1] میں حضرت جابرؓ کی روایت موجود ہے کہ جس شخص نے نماز پڑھی اور اُس نے فاتحہ نہ پڑھی تو گویا اُس نے نماز ہی نہ پڑھی اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ وَرَآءَ الْاِمَامِ سوائے اس حالت کے کہ وہ امام کے پیچھے یعنی مقتدی ہو۔ اسی طرح مؤطا امام محمد[2] میں حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی موجود ہے مَنْ صَلّٰی خَلْفَ الْاِمَامِ کَفَتْہُ قِرَاءَۃُ الْاِمَامِ جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی اُسے امام کی قرأت کفایت کرجاتی ہے اس کو علیحدہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام مسلمؒ[3] نے حضرت زیدؓ کی روایت بھی نقل کی ہے کہ جب اُن سے قرأت خلف امام کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا لَا قِرَاءَۃَ مَعَ الْاِمَامِ فِیْ شَیْءٍ امام کے ساتھ نماز پڑھنے میں کسی چیز میں قرأت نہیں ہے، نماز خواہ سری ہو یا جہری، صحابہ کرام میں سے صرف دو صحابہ عبادہ ابن صامتؓ اور محمود ابن ربیعؓ کا نام ملتا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مؤطا کی فارسی شرح میں[4] لکھتے ہیں کہ "خواندن فاتحہ با امام در صحابہ شائع نہ بود" یعنی صحابہ کرام میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا مشہور نہیں تھا کوئی اکا دکا ہی پڑھتا ہوگا، ورنہ سب خاموش رہتے تھے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ سب کا مسلک یہی ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے، خواہ سری نماز ہو یا جہری۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب امام قرأت کر رہا ہو تو تم خاموش رہو اور سنو۔ یعنی جب امام بلند آواز سے قرأت کر رہا ہو تو تم سنو اور جب دل میں پڑھ رہا ہو تو تم خاموش رہو، دونوں باتوں پر عمل ہو جائے گا۔

---

[1] ترمذی شریف ص ۱/۷۱ — [2] مؤطا امام محمد ص ۹۷

[3] مسلم ص ۱/۲۱۵ — [4] مصفّٰی شرح فارسی ص ۱/۱۳۱

آئمہ ثلاثہ کا مسلک

امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سری نمازیں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھ لے تو اس کو ثواب ملیگا، کہ یہ مستحب ہے۔ فرض یا واجب نہیں[1] ہے کہ ضرور ہی پڑھے، البتہ امام شافعیؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ فاتحہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ امام صاحب پہلے عراق میں مقیم تھے، اُس دوران وہ فاتحہ خلف الامام کو ضروری قرار دیتے تھے۔ پھر جب مصر تشریف[2] لے گئے تو وہاں پر بڑے بڑے اہل علم کے ساتھ بحث مباحثہ ہوا تو آپ نے اس مسئلہ سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ آپ کے دو قول ہیں۔ آپ قولِ قدیم کے مطابق فاتحہ خلف الامام ضروری قرار دیتے تھے مگر قولِ جدید کے مطابق آپنے اپنی کتاب الام میں[3] لکھا ہے کہ جس نماز میں امام بلند آواز سے قرأت کر رہا ہو، اس میں مقتدی کو سورۃ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیئے۔ ہاں سری نماز میں پڑھنا مستحب ہے۔ فرض واجب نہیں ہے۔

مسلک امام بخاریؒ و بیہقیؒ

امام بخاریؒ اور امام بیہقی دونوں حضرات فاتحہ خلف الامام کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ امام ترمذیؒ نے لکھا[4] ہے کہ بعض حضرات نے اس معاملہ میں تشدد کیا ہے ان میں سے امام بخاریؒ تیسری صدی ہجری کے اور امام بیہقیؒ چوتھی صدی کے محدث ہیں ان کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اُس کی نماز ہی نہیں ہوتی حالانکہ امام بخاریؒ کے استاد حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ جو آدمی نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز صحیح ہے۔ غرضیکہ یہ دو آئمہ کرام فاتحہ خلف امام کو لازم قرار دیتے ہیں

---

[1] مغنی ابن قدامہ ص ۵۵۲/۱ [2] البدایہ والنہایہ ص ۲۵۲/۱۰

[3] کتاب الام ص ۱۶۶/۷ ، [4] ترمذی ص ۷۱/۱

مسلک امام ابوحنیفہؒ

نماز میں سورۃ فاتحہ کا جو حکم ہے، وہ میں نے مختصراً عرض کر دیا اور اس میں مختلف آئمہ کا مسلک بھی بیان کر دیا۔ بعض لوگ غلط پراپیگنڈا کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ حدیث کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ امام صاحبؒ اِن تمام احادیث پر عمل کرتے ہیں جن کی صحت کے متعلق آئمہ میں اتفاق ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے دونوں قسم کی روایات منقول ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فاتحہ خلف امام کے قائل نہیں ہیں۔ مگر بعض سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ بھی قائل ہوں، اگر قائل ہیں تو وہ بھی استحباب کے درجے میں، فرض واجب نہیں سمجھتے۔ تینوں آئمہ کرام فرماتے ہیں کہ فاتحہ خلف امام صرف سری نمازوں میں مستحب ہے۔ جہری نماز میں قرأت کرنا امام کے ساتھ جھگڑا کرنے کے مترادف ہے، البتہ امام ابوحنیفہؒ امام اوزاعیؒ اور امام سفیان ثوریؒ کا مسلک یہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام نہ سری نماز میں پڑھے اور نہ جہری میں۔ نماز کی تین حالتیں پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ تینوں کا الگ الگ حکم ہے، لہٰذا اس کے مطابق ہی عمل کرنا چاہیے۔

خلاصہ بحث

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص منفرد نماز پڑھتا ہے یا بطور امام نماز پڑھاتا ہے تو وہ سورۃ فاتحہ بھی پڑھیگا اور اس کے ساتھ دوسری سورۃ بھی ملائے گا۔ اور اگر نمازی کسی امام کے پیچھے مقتدی ہے تو وہ خاموش رہے گا اور امام کی قرأت کو سنے گا کیونکہ اس کے لیے امام کی قرأت کفایت کر جائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک احادیث کے مطابق ہے اور اس سے تمام احادیث پر عمل ہو جاتا ہے۔ روایت کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے حصے کو چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ بعض نے تشدد کیا ہے، تشدد کرنا ٹھیک نہیں، بلکہ بات ہمیشہ دلیل کیساتھ ہونی چاہیئے۔ پھر دیکھیں کہ قوی دلائل کدھر ہیں چنانچہ قوی دلائل امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی حمایت میں ہیں لہٰذا امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳

ترجمہ، سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو پرورش کرنے والا ہے سب جہانوں کا (۱) جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے (۲) جو مالک ہے انصاف (جزا) کے دن کا (۳)

ربطِ کلام

اِس سے پہلے سُورۃ فاتحہ کے متعلق ضروری باتیں عرض کی جا چکی ہیں اور کل سُورۃ فاتحہ کے نماز میں پڑھنے کے حکم کا ذکر تھا۔ اب سُورۃ کے الفاظ اور اُن کی مختصر تشریح عرض کی جاتی ہے۔

کلمہ حمد

ارشاد ہوتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔ یہاں پر لفظ اَلْحَمْدُ جنس کے درجے میں مطلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ ازل سے لے کر ابد تک تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ حمد کا معنیٰ تعریف ہے اور امام ابن جریرؒ اسے شکر پر بھی محمول کرتے ہیں، گویا حمد شکر کا معنیٰ بھی دیتا ہے۔ لہٰذا یہ شکر کا کلمہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بہت ہی پسندیدہ کلمہ ہے، کیونکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکریہ بھی ادا ہوتا ہے۔ الحمد دُعا کا کلمہ بھی ہے۔ جب اِن الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ

کی مہربانیاں انسان کی طرف متوجہ ہوجاتی ہیں اُسے دُعا کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی اور اِس کا مقصد خود بخود پورا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان[1] ہے اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَفْضَلُ الدُّعَآءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یعنی سب سے افضل ذِکر کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر ہے اور تمام دُعاؤں میں افضل دُعا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اِسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سجدے[2] کی حالت میں اِن الفاظ کے ساتھ دُعا کیا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِی ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اے مولا کریم! میں تیری تعریف بیان نہیں کرسکتا، تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے خود اپنی تعریف بیان فرمائی ہے مخلوق میں کون ہے جو پورے طریقے سے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرسکے پوری مخلوق اللہ تعالیٰ کی کماحقہ تعریف کرنے سے عاجز ہے، تاہم ہر شخص حتی المقدور اپنے پروردگار کی حمد بیان کرتا ہے جس سے اُس کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

مسند احمد کی روایت[3] میں آتا ہے۔ اِنَّ رَبَّکَ یُحِبُّ الْحَمْدَ تیرا پروردگار حمد اور تعریف کو پسند فرماتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی[4] ہے کہ جب کوئی بندہ کوئی چیز کھاتا پیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تو اللہ تعالیٰ اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے اور کہتا ہے حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی ہے، اور میرا شکر ادا کیا ہے۔ صحیح حدیث[5] میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان بھی موجود ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ یعنی کلمہ الحمد للہ سے اللہ تعالیٰ کا میزان پُر ہوجاتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ سبحان اللہ اور الحمد للہ کو ملا کر پڑھنے سے

---

[1] ترمذی ص ۱۷۶ ج ۲، [2] مسلم ص ۱۹۲ ج ۱ [3] مسند احمد ص ۴۳۵ ج ۳

[4] [5] مسند احمد ص ۳۴۲ ج ۵

زمین و آسمان کی درمیانی فضا پُر ہو جاتی ہے، اِن کلمات کے اتنے اثرات اور ثمرات ہیں اِس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں جہاں بھی اہل ایمان کی صفت بیان کی ہے۔ وہاں خدا تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے کو اُن کی ایک صفت کے طور پر ظاہر کیا ہے جیسے فرمایا اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ (التوبہ) اللہ تعالیٰ نے غلطی کے ارتکاب پر توبہ کرنے والوں، عبادت گزاروں اور اُس کی حمد بیان کرنیوالوں کی تعریف کی ہے۔ ایک حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے[1] کہ آخری امت کے لوگوں کا ایک لقب حمّادون ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ تعریف بیان کرنے والے ہوں گے۔

ہر حالت میں حمد

حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے[2] کہ مومن ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتا ہے حتیٰ کہ اگر اُس کا کوئی عزیز بھی اُس کی آنکھوں کے سامنے جان دے رہا ہو، تو مومن پھر بھی الحمدللہ ہی کہتا ہے۔ جب کوئی شخص پورے اعتقاد کے ساتھ یہ کلمہ ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے۔ کہ اس شخص کے لیے جنت میں بیت الحمد تعمیر کرو۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے کہ مومن ہمیشہ یہی کہتا ہے[3] اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ حَالِ اَھْلِ النَّارِ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثنا ہے اور میں دوزخ والوں کے حال سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اِس حالت میں کسی کو نہ لے جائے۔

صفت ربوبیت

امام ابن جریر رح[4] اور بعض دوسرے مفسّرین فرماتے ہیں کہ الحمدللہ شکر کا کلمہ اس طرح ہے کہ جب کوئی شخص دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے وجود بخشا ہے، جسم دیا ہے

---

[1] سنن دارمی ص ۱۵ ج ۱ [2] مسند احمد ص ۱۷۳ ج ۱ [3] ابن ماجہ ص ۲۷۰

[4] تفسیر ابن کثیر ص ۲۱ ج ۱، تفسیر طبری ص ۵۹ ج ۱

صحت و تندرستی عطا کی ہے، پاک روزی اور نیک اولاد دی ہے۔ اِن ظاہری نعمتوں کے ساتھ ساتھ باطنی انعامات کے طور پر ایمان لانے کی توفیق بخشی ہے، علم عطا کیا ہے، سمجھ دی ہے، اچھی نیت اور اچھا اخلاق مرحمت فرمایا ہے، تو اس کی زبان سے بے ساختہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ادا ہو جاتا ہے، یعنی سب تعریفیں اس مالک الملک کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔ اس طرح گویا انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

لفظ "رب" کا معنیٰ

رب کا لفظی معنیٰ تربیت کرنے والا ہے اور مراد ہر چیز کو آہستہ آہستہ بتدریج حدِ کمال تک پہنچانا ہے۔ ہر صفت کا اپنا اپنا مفہوم ہوتا ہے جیسے ابداع کا معنیٰ ایجاد کرنا اور خلق کا معنیٰ پیدا کرنا، اسی طرح ربوبیت کا معنیٰ تربیت کرنا، پرورش کرنا حَالاً فَحَالاً آہستہ آہستہ بتدریج یعنی جس سٹیج پر جس چیز کی ضرورت ہو اُس کو بہم پہنچا کر حدِ کمال تک پہنچانا۔

لفظِ "عالم" کا مفہوم

یہاں پر لفظ عالمین ذکر کیا گیا ہے جو کہ عالم کی جمع ہے۔ لفظ عالم علامت کے مادے سے ہے۔ کائنات میں جتنے بھی جہان ہیں اور اِن جہانوں میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کی صناعی اور کاریگری کی علامت ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہر جہان کو عالم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہر مصنوع اپنے صانع کی علامت اور نشانی ہوتی ہے تو کائنات کی تمام چیزوں کو دیکھ کر آدمی سمجھ جاتا ہے کہ یہ کسی کاریگر کی بنائی ہوئی ہیں۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتا ہے پھر جب کوئی شخص مزید غور و فکر کرتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ ہر مخلوق کی تمام ضروریات مہیا کرنے والا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ پکار اُٹھتا ہے لَا رَبَّ سِوَاہُ کہ اس کے علاوہ کوئی رب نہیں، ہر چیز کو بتدریج حدِ کمال تک پہنچانے والی وہی ذات ہے۔

امام ابن جریرؒ، امام ابن کثیرؒ، امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام[1] بیان کرتے ہیں کہ عالموں کی کُل تعداد اٹھارہ ہزار ہے۔ ہم انسانوں کے جہان میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملائکہ کا جہان ہے، جنات کا جہان، برزخ، حشر اور آخرت کے جہان ہیں۔ اور پھر اس سطح ارضی پر، درندوں، پرندوں اور چرندوں کے الگ الگ جہان ہیں۔ کوئی مکھیوں کا جہان ہے، کوئی کیڑوں مکوڑوں کا جہان ہے۔ نباتات اور جمادات کے جہان ہیں۔ اور پھر پانی کے اندر مچھلیوں اور دیگر بے شمار آبی جانوروں کے جہان ہیں۔ ہم چونکہ انسانی عالم میں رہتے ہیں اس لیے ہم اسی سے بحث کرتے ہیں، قرآن کریم کا موضوع بھی عالم انسانیت کی تکمیل ہی ہے۔ لہذا باقی جہانوں کو زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے۔ بہر حال لفظ رب العالمین سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام کے تمام جہانوں کی پرورش کرنے والا وہی خدا تعالیٰ ہے لہذا تمام تعریفیں بھی اُسی کے لیے ہیں

صفت رحمان اور رحیم

فرمایا تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پرورش کنندہ ہے نیز اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ وہ بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ یہاں پر رحمان اور رحیم دو صفات کا ذکر کیا گیا ہے اور دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، البتہ لفظ رحمان میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ امام بیضاویؒ[2] اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ رحمان کو رحمان الدنیا کہا جاتا ہے کیونکہ اس جہان میں اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت ہر کس و ناکس کے لیے ہے اور اس میں مومن اور کافر کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں بلا تخصیص ہر ایک کو میسر ہیں، یہ اُس کی صفت رحمانیت کا ظہور ہے۔ تاہم جہاں تک صفت رحیمیت کا تعلق ہے یہ اپنی تمام تر اضافیت کے باوجود اہل ایمان کے لیے مخصوص ہے اس لیے اس کو رَحِیۡمُ الۡاٰخِرَۃِ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۲۴ ج ۱، تفسیر طبری ص ۶۳ ج ۱ [2] تفسیر بیضاوی ص ۷ ج ۱

کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ظہور اس کے خاص بندوں پر ہوگا جو اس دُنیا میں ایمان لائے، اس کی وحدانیت کو تسلیم کیا اور اُس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کی آخرت میں ایسے لوگوں پہ بے حد وبےشمار انعامات ہوں گے، اللہ تعالیٰ اِن کو نجات دے گا۔ اور بلند مقام تک پہنچائے گا۔ بہر حال رحمان اور رحیم دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی اِن صفات کو سمجھنے کے لیے روزمرہ پیش آنے والی مثالیں کافی ہیں۔ ایک[1] دفعہ جنگ کے موقع پہ ایک عورت کا شیر خوار بچہ گم ہو گیا بیچاری ماں بچے کی جدائی میں نیم پاگل ہو گئی۔ دیوانہ وار ادھر اُدھر دوڑنے لگی اور جو بھی شیر خوار بچہ ملتا اس کو اپنا بچہ سمجھ کر سینے سے لگاتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دیکھا تو صحابہؓ سے فرمایا کہ دیکھو اس عورت کا بچہ گم ہو گیا ہے اور یہ اس کے لیے کس قدر پریشان ہے کیا اس عورت کے لیے ممکن ہے کہ اتنے پیارے بچے کو یہ خود آگ میں ڈال دے صحابہؓ نے عرض کیا، حضور! ایسا تو نہیں ہو سکتا، جو عورت اپنے بچے کے لیے اِس قدر تڑپ رہی ہے وہ اسے آگ میں کیسے ڈال سکتی ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ یاد رکھو! خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر اس ماں سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود ہی انہیں جہنم میں ڈال دے۔ یہ تو خود انسان ہیں جو اپنے مالک کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں اور کفر و شرک کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو جہنم کا سزاوار بناتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو انسانوں پہ نہایت ہی مہربان ہے۔

ایک دفعہ دورانِ سفر ایک صحابی کہیں سے چڑیا کے بچوں کو پکڑ کر اپنی چادر میں ڈال لایا۔ چڑیا سخت پریشان ہوئی اور چادر کے اُوپر منڈلانے لگی۔ جب اُس صحابی نے چادر کھولا تو چڑیا فوراً بچوں پر گر پڑی، اس نے بچوں کی محبت میں خود اپنی گرفتاری کی بھی

---

[1] ـــه　　　ـــه

پڑوا نہ کی، یہ واقعہ جب حضور علیہ السلام کے سامنے بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا، ایسا نہ کرو۔ جاؤ اِن بچوں کو اسی درخت پر چھوڑ آؤ جہاں سے اٹھایا تھا۔ پھر آپ نے یہ بات سمجھائی کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے جانوروں میں بھی اتنی محبت رکھی ہے کہ وہ اپنے بچوں پر زیادتی کو برداشت نہیں کر سکتے، خدا تعالیٰ نے انہیں اتنا شعور دے رکھا ہے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گائے بھینس اور بکری وغیرہ کے دِل میں اس قدر محبت ڈال دی ہے کہ وہ زمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے تسلی کر لیتی ہے کہ کہیں اس کا بچہ نیچے نہ آجائے پھر آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سو حصے ہیں، جن میں سے صرف ایک حصہ اُس نے اپنی تمام مخلوق پر تقسیم کیا ہے اور باقی ننانوے حصے اپنے پاس رکھے ہیں، اِس دُنیا میں انسانوں حیوانوں، چرندوں اور پرندوں کے دلوں میں اپنی اولادوں کے لیے جتنی محبت موجود ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا صرف ایک حصہ ہے جب قیامت کا دِن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس ایک حصے کو باقی ننانوے حصوں کے ساتھ مِلا کر پورے سو درجے کی مہربانیاں اپنے اہل ایمان بندوں پر فرمائے گا۔ اب جب کہ انسانی سوسائٹی پر اللہ تعالیٰ کی بہت سی مہربانیاں جلوہ گر ہیں تو ہر انسان خصوصاً اہل ایمان پر صفت رحمانیت اور رحیمیت کے اثرات نظر آنے چاہئیں

ایک دوسرے پر رحم

اس کی عملی صورت کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[2] ہے اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۤءِ تم زمین میں رہنے والے انسانوں پر رحم کرو۔ بلندیوں میں رہنے والا پروردگار تم پر رحم فرمائے گا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا[3] مَنْ لَّا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اُس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا

---

[1]   [2] ترمذی صفحہ ۱۴ ج ۲   [3] بخاری صفحہ ۸۸۷ ج ۲

خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے[1] اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ میں نے ظلم کو اپنے نفس پر حرام کر رکھا ہے فَلَا تَظَالِمُوْا اے لوگو! تم بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔

روزِ جزا

آگے ارشاد ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جو جزا کے دن کا مالک ہے۔ دین کا معنیٰ اطاعت بھی ہوتا ہے اور ملت بھی اسی لیے دین الانبیاء سے مراد انبیاء علیہم السلام کی ملت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دین کا معنیٰ بدلہ اور جزا بھی ہوتا ہے اور اس کا معنیٰ انصاف بھی ہوتا ہے اس مقام پر یہی معنیٰ مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بے حد مہربانیاں کی ہیں، ان پر بڑے انعامات فرمائے ہیں، اُن کے لیے ہدایت کے راستے متعین کیے ہیں مگر یہ پھر بھی دنیا میں ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں، ایک دوسرے کا حق غصب کرتے ہیں جس کا ازالہ بسا اوقات اس دُنیا میں نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ چونکہ احکم الحاکمین ہے، وہ اپنے بندوں پر ظلم و زیادتی کو برداشت نہیں کرتا، لہٰذا اُس نے اپنے پاس انصاف کا ایک دِن مقرر کر رکھا ہے جس دِن اِس دنیا میں کی گئی ہر زیادتی کے متعلق ٹھیک فیصلہ ہوگا اور ہر ایک کو اُس کی کارکردگی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اِسی کو یوم الدین کہا گیا ہے اور اس دن کا مالک بھی خود خدا تعالیٰ ہے، اُس دن ہر ایک کو پورا پورا انصاف مہیا ہوگا۔ اِس دُنیا میں تو غلط فیصلے بھی ہو جاتے ہیں۔ کسی کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور کسی کی حق رسی نہیں ہوتی، مگر انصاف کے دِن آخری اور قطعی فیصلے ہوں گے اور ہر ایک کو انصاف دلایا جائے گا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے[2]، لوگو! حقوق ادا کرو، ورنہ قیامت کے دِن بہت رسوائی ہوگی۔ انسانوں کا معاملہ تو اور ہے اللہ تعالیٰ جانوروں کو بھی انصاف دیے

---

[1] مسلم ص ۳۱۸ ج ۲ — [2] ترمذی ص ۶۷ ج ۲

بغیر نہیں چھوڑے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بے سینگ بکری کو سینگ والی بکری سے انصاف دلایا جائے گا، کیونکہ اس کے ساتھ اس دنیا میں زیادتی کی گئی تھی۔ انسان تو مکلف ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر نعمت سے سرفراز فرمایا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دُنیا میں کسی پہ زیادتی ہو اور اس کا بدلہ نہ دلایا جائے۔ انصاف کے دِن سب کے ساتھ ٹھیک انصاف ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کی جزا ملے گی۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ﴿۴﴾

ترجمہ:۔ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں ﴿۴﴾

عبادت و استعانت میں تخصیص

سُورۃ الفاتحہ کی پہلی تین آیات میں غائبانہ طریقے پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی گئی تھی اور اب چوتھی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست خطاب ہے، بندہ اپنے مالکِ حقیقی سے مخاطب ہوتا ہے کہ اے پروردگار! جس کا ذاتی نام اللہ ہے اور جس کی صفات رب، رحمان، رحیم اور مالک ہیں، بندہ اُس کے حضور عرض کرتا ہے، اِیَّاكَ نَعْبُدُ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اور خاص تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ امام زمخشریؒ اور امام بیضاویؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں[1] نَخُصُّكَ بِالْعِبَادَةِ وَالْاِسْتِعَانَةِ یعنی ہم خاص کرتے ہیں تجھ کو عبادت اور استعانت کے ساتھ۔ کائنات میں کوئی اور ایسی ہستی نہیں ہے جس کی عبادت کی جاسکے یا جس سے استعانت (مدد طلب) کی جائے۔ استعانت سے مراد مافوق الاسباب غائبانہ مدد ہے اور یہ صرف ذاتِ خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح عبادت بھی سوائے خدا تعالیٰ کے کسی اور کی روا نہیں ہے۔

ضمیر میں تقدم و تاخر

اِس آیت کریمہ میں اِیَّاكَ مفعول کی ضمیر ہے اور عربی زبان کا اسلوب کلام یہ ہے کہ مفعول یا اُس کی ضمیر، فعل اور فاعل کے بعد آتی ہے مگر یہاں پر مفعول کی ضمیر اِیَّاكَ کو پہلے لایا گیا ہے جب کہ فعل اور فاعل نَعْبُدُ اور نَسْتَعِیْنُ کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں علمِ معانی والے کہتے ہیں کہ جس لفظ کا حق مؤخر ہوتا ہے، جب

---

[1] تفسیر بیضاوی ص $\frac{8}{1}$، تفسیر کشاف ص $\frac{14}{1}$

اُسے مقدم لایا جائے تو اس سے متعلقہ مقصد کا حصر مطلوب ہوتا ہے اور اُسے مفعول کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس آیت میں مفعول کی ضمیر کو مقدم لانے کا مطلب یہ ہے کہ عبادت اور استعانت صرف ذاتِ خداوندی میں بند ہے، یہ چیز کسی دوسری ذات کے ساتھ روا نہیں رکھی جا سکتی۔ اِسی لیے آیت کا معنیٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اے پروردگار! ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

عبادت و استعانت میں تقدم و تاخر

امام محمد ابن ابی بکر بن عبدالقادر رازیؒ نے مسائل القرآن کے نام سے ایک مختصر سی تفسیر لکھی ہے جس میں صرف اُن آیات کی تشریح بیان کی گئی ہے جن میں کچھ پیچیدگی پائی جاتی ہے یا جن پر بعض اعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔ اس مقام پر امام رازیؒ نے یہ نقطہ اٹھایا ہے[۱] کہ اِس آیت کریمہ میں عبادت کا پہلے ذکر ہے اور استعانت کا بعد میں۔ حالانکہ عام فہم بات یہ ہے کہ پہلے استعانت طلب کی جاتی اور پھر عبادت کی بات ہوتی یعنی اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگی جاتی ہے اور پھر اس توفیق کے بعد عبادت کی جاتی ہے کیونکہ قرآن پاک میں موجود ہے وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ اُس کی توفیق کے بغیر کوئی انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

اس عقدے کو امام صاحب نے خود ہی اس طرح حل کیا ہے کہ عبادت کی ایک قسم توحید فی العبادت بھی ہے یعنی صرف اور صرف خدا ذوالجلال ہی کی عبادت کرنا۔ اور عبادت موقوف ہے اصلاح عقیدہ پر۔ جب تک عقیدہ درست نہیں ہوگا کوئی عبادت درست نہیں ہوگی قرآن پاک میں موجود ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (انبیاء) جو شخص مومن ہو کر کوئی نیک عمل کرے تو اس کے کام کی ناقدری نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی سعی

---

[۱] مسائل الرازی واجوبتھا ص۲

مشکور ہوگی۔ تو فرماتے ہیں کہ عقیدے کی درستگی چونکہ بنیادی چیز ہے اور اسی پر ہر عمل کا دارومدار ہے، لہٰذا اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کو مؤخر کیا گیا ہے۔

مردم خیز خطہ

امام محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر رازیؒ جنہوں نے مذکورہ تقدم و تاخر کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ شہر ری کے رہنے والے تھے، کسی زمانے میں یہ بڑا مردم خیز خطہ تھا، اللہ تعالےٰ نے اس سرزمین میں بڑے بڑے دیندار لوگ پیدا کیے ہیں۔ یہی امام محمد بن ابی بکر رازیؒ ہیں جنہوں نے قرآنِ پاک کی تفسیر کے علاوہ مختار الصحاح کے نام سے لغت کی کتاب بھی لکھی۔ امام ابوبکر جصاص رازیؒ بھی اِسی سرزمین کے رہنے والے تھے آپ نے بھی قرآن پاک کی نہایت عمدہ تفسیر لکھی ہے۔ احکام القرآن کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں یہ تفسیر صرف اُن آیات کی ہے جن میں احکام بیان کیے گئے ہیں مثلاً حلال و حرام کے احکام، صوم و صلوٰۃ، جہاد، صدقہ خیرات وغیرہ کے احکام۔ اس قسم کی تفسیر آپ کے بعد بھی لوگوں نے لکھی ہے مگر امام جصاصؒ کی تفسیر کے پایہ کی کوئی دوسری تفسیر نہیں ہے۔ آپ چوتھی صدی کے حنفی مسلک کے امام تھے۔ اسی طرح امام فخرالدین رازیؒ کی تفسیر کبیر کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ سلطان محمد غوریؒ کے زمانے میں چھٹی صدی کے آخر میں ہوئے، آپ کی وفات ۶۰۶ھ ہے آپ بھی اسی مردم خیز خطہ ری میں ہوئے ہیں۔ اِن کے علاوہ اس سرزمین نے اور بھی بہت سے قابل اور دین سے محبت رکھنے والے فرزند پیدا کیے ہیں۔

عبادت میں خلوص

بہرحال امام محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر رازیؒ نے یہ نقطہ بیان فرمایا ہے، کہ جب تک عقیدہ درست نہ ہو عبادت میں خلوص پیدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص۶۹ ج۱

ہے لُبَابُ الْقُرْاٰنِ فِی الْحَوَامِیْمِ السَّبْعَۃِ یعنی قرآنِ کریم کا خلاصہ حم سے شروع ہونے والی سات سورتوں میں ہے اسی طرح سورۃ یٰس کو قرآن پاک کا قلب کہا گیا ہے[1]۔ اِن سب میں مشترک چیز یہی ہے فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ (الزمر) یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس حالت میں کہ عبادت میں اخلاص کرنے والے ہو۔ امام اُبوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اخلاص اُسی وقت پیدا ہو گا جب ایمان پاک ہو گا اور اس میں کفر، شرک، نفاق، شک اور الحاد کی ملاوٹ نہیں ہو گی۔ اگر ایمان میں اِن چیزوں کی ملاوٹ ہو گی تو اخلاص پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حوامیم سبعہ میں یہی بات سمجھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہایت اخلاص کے ساتھ کرو جس کے لیے سب سے پہلے عقیدے کی درستگی ضروری ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشادِ مبارک[2] ہے کہ انسانی جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہے تو سارا جسم صحیح ہے اور اگر وہ لوتھڑا بگڑا ہوا ہے تو سارا جسم ہی بگڑا ہوا ہے فرمایا الا وھی القلب یاد رکھو وہ لوتھڑا دِل ہے۔ اس کی اصلاح پر سارے جسم کا دارومدار ہے۔ قلب مرکزِ اخلاق ہوتا ہے۔ ایمان، کفر، اخلاص، شک، تردد، محبت اور نفرت اِس میں ہوتے ہیں، لہٰذا اس کی صحت ضروری ہے۔ اِسی طرح سورۃ یٰس کو قرآن پاک کا دِل کہا گیا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں چار بنیادی حقائق یعنی توحید، رسالت، وحی الٰہی اور قیامت کے مسائل نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ گویا جس طرح حوامیم میں عقیدے کی درستگی اور توحید پر زور دیا گیا ہے اسی طرح سورۃ یٰس میں بھی یہی چیز بیان کی گئی ہے۔ تو امام اُبوبکر رازیؒ فرماتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو مقدم لانے سے یہی مقصود ہے کہ پہلے عقیدہ پاک ہو جائے تو اس کے بعد باقی امور انجام دیئے جائیں گے۔

---

[1] ترمذی ص ۱۱۶ ج ۲ — [2] بخاری ص ۱۳ ج ۱

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[1] بھی فرماتے ہیں کہ انسان کی حقیقی سعادت اللہ تعالےٰ کی عبادت پر موقوف ہے۔ اگر انسان اللہ کی صحیح طریقے سے عبادت کریں گے تو اُن کو سعادت نصیب ہوسکے گی، اس کے بغیر کوئی آدمی سعادت مند نہیں ہوسکتا۔ اِس دُنیا کی سعادت کے تو بہت سے ذرائع ہیں جیسے مال و دولت کا مل جانا، کسی پارلیمنٹ کا ممبر بن جانا، اقتدار حاصل ہوجانا، زن و فرزند کا حاصل ہوجانا وغیرہ وغیرہ مگر حقیقی سعادت اخلاص فی العبادت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

اللہ اور بندوں کا حق

حدیث شریف میں آتا ہے[2] کہ کسی سفر کے دوران حضرت معاذؓ حضور علیہ السلام کے ساتھ سواری پر پیچھے بیٹھے تھے۔ راستے میں آپ نے حضرت معاذؓ سے پوچھا، معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ عرض کیا، حضور! اللہ اور اُس کا رسُول ہی بہتر جانتے ہیں۔ پھر آپ نے خود ہی فرمایا کہ اللہ کا حق اپنی اشرف مخلوق پر ہے اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا کہ بندے صرف اُسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہر انسان پر ہے، جو اس کی خلاف ورزی کرے گا، اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنے گا۔

پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا، معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر کیا ہے؟ انہوں نے پھر عرض کیا، حضور! اللہ اور اس کا رسُول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب بندے صرف خدا وحدہٗ لاشریک ہی کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے تو پھر بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے اَنْ لَّا يُعَذِّبَهُمْ کہ وہ اُن کو عذاب نہیں کریگا بلکہ جنت میں داخل کرے گا۔ سورۃ یُونس میں فرمایا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ

---

[1] حجۃ اللہ صفحہ ۵۱ ج ۱ باب حقیقۃ السعادۃ [2] مسلم صفحہ ۴۴ ج ۱، بخاری صفحہ ۲ ج ۱

یہ بات ہمارے ذمے ہے کہ ہم اہل ایمان کو نجات دے دیں گے۔ سورۃ روم میں فرمایا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ انسان کا خالق اور مالک ہے اس لیے اُس کا حق تو بندوں پر ہے مگر انسان بحیثیت مخلوق اور مملوک ہونے کے اللہ تعالےٰ پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ تاہم جیسا کہ قرآن پاک سے اخذ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور مہربانی کے ساتھ بندوں کے بعض حقوق اپنے ذمے لے رکھے ہیں، ورنہ کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ پر کوئی حق قائم کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس قسم کے حقوق کی بات دیگر احادیث میں بھی ملتی ہے جیسے حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] کہ جو شخص کسی دوسرے آدمی کی عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے، تو ایسے شخص کے لیے اللہ کے ذمے یہ حق ہے کہ وہ اُسے آخرت کی پریشانیوں سے بچائے۔ بہرحال اس قسم کے حقوق اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔

الوہیت کی شرائط

بندے اپنے اللہ کے حضور اقرار کرتے ہیں اِيَّاكَ نَعْبُدُ پروردگار ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لیے ضروری ہے کہ وہ الٰہ یعنی معبود ہے اور الوہیت کی بعض شرائط ہیں جو صرف خدا تعالےٰ کی ذات میں پائی جاتی ہیں، لہذا عبادت بھی اُس کی ضروری ہے۔

الوہیت کی پہلی شرط واجب الوجود ہونا ہے، یعنی عبادت کے لائق وہ ہستی ہے جس کا وجود خود بخود ہے اور کسی دوسری ہستی کا عطا کردہ نہیں۔ یہی چیز خدا تعالیٰ کو باقی مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔ باقی ہر چیز کا وجود خدا تعالیٰ کا عطا کردہ ہے جب کہ

---

[1] ترمذی ص۱۵ ج۲

اُس کا اپنا وجود خود بخود ہے۔ فارسی میں اللہ تعالیٰ کو خدا اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ اُس کی ذات خود بخود ہے۔

الوہیت کی دوسری شرط قادرِ مطلق ہونا ہے۔ یعنی عبادت صرف ایسی ہستی کی ہو سکتی ہے جو اپنی منشاء کے مطابق جو چاہے کرے اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اِسی لیے قرآن پاک میں جگہ جگہ آتا ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی قادرِ مطلق ہے۔

الوہیت کی تیسری شرط علیم کُل ہونا ہے۔ عبادت صرف اُسی ذات کی ہو سکتی ہے جو کائنات کے ذرے ذرے سے واقف ہو اور کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہ ہو۔ یہ شرط بھی صرف اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہے۔ ہر چیز کا ازلی ابدی علم صرف اُسی کے پاس ہے وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ وہی ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اُس کا علم ذرے ذرے پر محیط ہے مخلوق میں سے مقرب ترین ہستیاں انبیاء، فرشتے حتیٰ کہ سیدالانبیاء اور جبرائیل علیہ السلام کا علم بھی محدود ہے اور علیم کل صرف ذاتِ خداوندی ہے۔

الوہیت کی چوتھی شرط خالق ہونا ہے۔ ہر چیز کا پیدا کرنے والا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ موجود ہے اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (الزمر) ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ نیز اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف) پیدا کرنا بھی اُسی کا کام ہے اور ہر چیز پر حکم بھی اُسی کا چلتا ہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ (النحل) کیا پیدا کرنے والا اور پیدا نہ کرنے والا برابر ہو سکتے ہیں، ہرگز نہیں۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰہِ یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (فاطر) کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق بھی ہے جو تمہارے لیے آسمان اور زمین سے روزی کے

سامان پیدا کرتا ہے؟ جواب پھر وہی آتا ہے کہ کوئی نہیں۔

غرضیکہ فرمایا کہ عبادت کے لائق وہی ذات ہو سکتی ہے جس میں یہ چار شرائط پائی جائیں۔ یعنی وہ واجب الوجود ہو، قادر مطلق ہو، علیم کُل ہو، اور خالق ہو۔ یہ چاروں شرائط چونکہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا عبادت کے لائق بھی وہی ذات ہے۔ اسی لیے بندوں کی زبان سے کہلوایا گیا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ اے پروردگار! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ کسی اور کی عبادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

توحید کے چار درجات

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ توحید کے چار درجات ہیں۔ ان میں سے دو درجوں میں تو سب مومن، کافر، مشرک وغیرہ متفق ہیں۔ مگر باقی دو درجوں میں کفار و مشرکین اہل ایمان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

توحید کا پہلا درجہ واجب الوجود ہونا ہے۔ اس پر سب متفق ہیں۔ کہ واجب الوجود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، صرف اُس کا وجود خود بخود ہے۔ باقی ہر مخلوق کا وجود عطائی ہے۔ توحید کا دوسرا درجہ صفتِ خلق ہے۔ کسی سے پوچھیں ہر چیز کا خالق کون ہے تو کہیں گے کہ خدا تعالیٰ، ایشور یا گاڈ GOD ہے۔ صرف دہریوں کی قلیل تعداد کے علاوہ باقی تمام مذاہب اللہ تعالیٰ ہی کو خالق مانتے ہیں۔ گویا ان دو درجات میں سب کا اتفاق ہے۔

توحید کا تیسرا درجہ تدبیر ہے۔ یہاں آکر کافر و مشرک اہل ایمان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ ایمان والوں کا نظریہ یہ ہے کہ ہر چیز کا تدبیر کنندہ یعنی مدبر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں موجود ہے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ بلندیوں سے لیکر پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۵۹ ج ۱

یہاں آکر نجومی (ستارہ پرست) اور مشرک علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ نجومی ستاروں کو مدبر مانتے ہیں۔ اور قبر پرست قبر والوں سے اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں پیر پرست اپنے پیروں کو مدبر جانتے ہیں، بعض لوگ فرشتوں، جنات اور بھوت پریت کے ساتھ اپنی توقعات وابستہ کرتے ہیں مگر اہل ایمان صرف اللہ تعالیٰ کو ہی مدبر حقیقی مانتے ہیں۔

توحید کا چوتھا درجہ عبادت کا ہے، عبادت انتہائی درجے کی تعظیم کا نام ہے یہاں پر بھی لوگ شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایمان والے کہتے ہیں کہ عبادت صرف اُسی ذات کی ہو سکتی ہے۔ جو واجب الوجود، قادرِ مطلق علیم کُل، نافع ضار اور ہر چیز میں متصرف ہے، مگر مشرک لوگ عبادت میں بھی دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ عبادت قولی بھی ہوتی ہے اور فعلی بھی۔ عبادت مال سے بھی ہوتی ہے اور نذر و نیاز میں بھی مشرکین نے قبروں اور بتوں کی پوجا شروع کر دی، کسی نے جنات اور فرشتوں کو معبود بنا لیا، نجومیوں نے ستارہ پرستی شروع کر دی، نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو معبود بنا لیا اور یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ دیا مگر صحیح ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی دوسری ذات کو شریک نہ کیا جائے اسی لیے یہاں پر فرمایا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ اے مولا کریم! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور اس میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے۔ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اور استعانت بھی تیری ہی ذات سے طلب کرتے ہیں۔ ہم عبادت اور استعانت تیری ذات کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔ تیرے سوا کوئی ذات اس کی اہل نہیں ہے۔ عبادت کے بارے میں مزید کچھ عرض کیا جائے گا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④

ترجمہ:- ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں ④

ربطِ مضامین

سُورۃ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور اُس کی صفات بیان کی گئیں، اس کے ذاتی نام اللہ اور صفاتی نام رب، رحمان، رحیم اور مالک کا ذکر کیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے براہِ راست خطاب کیا گیا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اے مولا کریم! تو جو ان صفات کا مالک ہے، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ عبادت کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ صرف اُسی ذات کی ہو سکتی ہے جو واجب الوجود، قادرِ مطلق، علیمِ کُل اور خالق ہو۔ الوہیت کی صفات چونکہ صرف اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں، لہٰذا عبادت کا مستحق وہی ہے۔

عبادت کی تعریف

امام بیضاویؒ اور بعض دیگر مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ عبادت کہتے ہیں۔ اَقْصٰی غَایَۃُ التَّعْظِیْمِ یعنی انتہائی درجے کی تعظیم، مگر یہ تعظیم اس اعتقاد کے ساتھ پیدا ہونی چاہیئے کہ جس ذات کی تعظیم کی جا رہی ہے وہ واجب الوجود، قادرِ مطلق، علیمِ کُل اور نافع و ضار ہے عبادت گزار یا تعظیم کنندہ کے دِل میں یہ پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ یہ تعظیم اُس ذات کے لیے کی جا رہی ہے جو تمام اشیاء میں تصرف کرنیوالی زندہ کرنیوالی، مارنے والی، روزی دینے والی اور شفا بخشنے والی ہے، پھر تعظیم قول سے بھی ہوتی ہے، عمل سے بھی اور مال سے بھی۔ اِسی لیے ہم قعدے میں پڑھتے ہیں۔ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبٰتُ یعنی تمام بدنی، قولی اور مالی عبادتیں اللہ

---

[1] تفسیر بیضاوی ص ۹ ج ۱

ہی کے لیے ہیں۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو خالق، مالک، قادر، مختار، نافع، ضار اور معطی سمجھنے کے باوجود اپنی حاجات اُس کے سامنے پیش کرنے کی بجائے کسی دوسری ہستی کے سامنے پیش کرتا ہے تو ایسا شخص آزاد اور شریف نہیں ہوگا بلکہ غلام اور مشرک سمجھا جائیگا۔ کیونکہ وہ اپنی ضروریات اپنے حقیقی مالک کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے

عبادت کی غایت

عبادت کے متعلق مفسرین کرام یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عبادت یا تو ثواب حاصل کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچنے کے لیے چنانچہ قرآن پاک میں اکثر انبیاء کے تذکرے میں سورۃ انبیاء میں ہے یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وہ ہمیں پکارتے ہیں، ہمارے سامنے دستِ دُعا پھیلاتے ہیں ہماری نعمتوں میں رغبت کرتے ہوئے اور ہماری گرفت سے ڈرتے ہوئے۔ اللہ تعالےٰ کی عبادت اس لیے بھی کی جاتی ہے کہ انسان کو اُس کے ہاں عظمت، بزرگی اور شرافت حاصل ہو، یا عبادت اس لیے کی جاتی ہے کہ معبود برحق وہی ہے۔ وہی خالق ہے اور عبادت گزار اُس کا بندہ ہے اور بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مالک کی تعظیم بجالائے۔ چنانچہ جب کوئی انسان پوری کائنات میں غور و فکر کرتا ہے تو اُسے یقین آجاتا ہے کہ اس کائنات کا مالک اور متصرف وہی ہے، ہر چیز پر اُسی کا کنٹرول ہے، لہٰذا عبادت بھی اُسی کی ہو سکتی ہے اور اس میں کسی دوسری ذات کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔

خاندان شاہ ولی اللہؒ

برصغیر پاک و ہند میں دین کے جو بڑے بڑے امام اور پیشوا گزرے ہیں، اور جنھوں نے اپنی زندگی کی تمام توانائیاں دینِ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیں اُن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خاندانِ شاہ ولی اللہؒ کو امتیاز حاصل ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، آپ کے چاروں فرزند، آپ کے شاگردانِ رشید اور پھر شاگردوں کے

شاگرد علمائے دیوبند نے دین کی بے حد خدمت کی ہے۔ دین کی تبلیغ کے لیے درس گاہیں قائم کی گئیں، کتابیں لکھی گئیں اور خاص طور پر قرآن کی تشریح میں کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے فرزند شاہ عبدالعزیزؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو اپنے والد محترم کے شاگرد اور پھر آپ کے جانشین ہوئے۔ آپ نے فارسی زبان میں قرآن پاک کے کچھ حصےؔ کی تفسیر لکھی ہے، جس کے متعلق حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو کہا جا سکتا تھا کہ حضور علیہ السلام کی امت پر تفسیر قرآنِ پاک کا جو فریضہ عاید ہوتا تھا، وہ مکمل ہو گیا مگر افسوس کہ وہ تفسیر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ چونکہ آپ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے، لہذا آپ نے تفسیر کا ابتدائی حصہ املا کرایا، زندگی نے مہلت نہ دی اور یہ کام نامکمل رہ گیا۔ اس تفسیر میں شاہ صاحب نے قرآن پاک کو بہترین طریقے سے سمجھایا ہے۔ خود امام شاہ ولی اللہؒ جذبۂ دین سے سرشار ہو کر فرماتے ہیں کہ اسلام اور اہلِ اسلام کی خیر خواہی مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے ہوتی رہی ہے آپ اپنے دور کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دِل میں القا کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ دین کو ایک مکمل شکل میں ظاہر کیا جائے، چنانچہ آپ نے "حجۃ اللہ البالغہ" جیسی عظیم کتاب لکھی۔ اس کتاب کے ذریعے آپ نے دین کا فلسفہ، شرائع، قوانین اور پورا نظام بہترین طریقے سے سمجھائے ہیں۔

عبد اور معبود کے درمیان نسبت

بہر حال شاہ عبدالعزیزؒ اپنی تفسیر[1] میں عبادت کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں "حقیقتِ عبادت تصحیح نسبتِ عبودیت است" یعنی عبادت دراصل بندے کی اپنے معبود کیساتھ نسبت کی درستگی کا نام ہے۔ اگر یہ نسبت درست نہ ہو سکی تو عبادت نہیں ہو گی۔ فرماتے ہیں کہ نسبت کی تصحیح اس طرح ہو گی کہ انسان اپنے آپ کو ممکن اور

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۱۱۷ ج ۱، تفسیر سورۃ بقرہ

اللہ تعالیٰ کی ذات کو واجب الوجود سمجھے۔ ممکن کا مطلب یہ ہے کہ یہ وجود کسی زمانے میں موجود نہیں تھا، پھر یہ اس دنیا میں معرضِ وجود میں آیا۔ اور پھر ایک دور ایسا آئیگا جب یہ وجود نہیں ہوگا، تو گویا ممکن وہ ہوتا ہے جو دو عدموں کے درمیان ہو۔ آدمی اِس دُنیا میں آتا ہے، کئی اچھے اور بُرے اعمال انجام دیتا ہے اور پھر ایک شعلے کی طرح بجھ جاتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ دہریے، کافر یا کم علم لوگ سمجھتے ہیں کہ آدمی مر کر ختم ہو جاتا ہے حالانکہ انسانی زندگی لافانی ہے۔ اس زندگی میں ایک تسلسل ہے جو مختلف سٹیجوں سے گزرتا ہوا برقرار رہتا ہے۔ اِس دُنیا میں آنے سے پہلے بھی انسانی زندگی کی ایک سٹیج تھی۔ اِس دنیا میں وہ دوسری سٹیج پہ آیا۔ یہاں پہ اپنی مقررہ عمر گذارنے کے بعد انسان پہ طبعی موت واقع ہوتی ہے اور وہ زندگی کے اگلے سٹیج میں چلا جاتا ہے پھر جب حشر کا میدان قائم ہوگا تو وہ ایک علیحدہ سٹیج ہوگی، وہاں سے گذر کر انسان اپنی آخری سٹیج پہ پہنچ جائے گا۔ مطلب یہ کہ انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ ایک سٹیج سے دوسری سٹیج کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔

بہرحال شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ عبد اور معبود کے درمیان تصحیح نسبت اسی طرح ہوسکتی ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ جب کہ خدا تعالیٰ کا وجود خود بخود ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کو مالک اور اپنے آپ کو مملوک خیال کرے اور یہ اچھی طرح سمجھ لے وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ (الانعام) یعنی اپنے مالک کو اپنے اُوپر غالب اور خود کو مغلوب سمجھے اور جان لے کہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے اپنے بندے کی گرفت کر سکتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نسبت کی درستگی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ خود کو مقدور اور اللہ تعالیٰ کو قادر سمجھے۔ اسی طرح بندہ اپنے آپ کو مامور اور خدا تعالیٰ کو آمر سمجھے یعنی اپنے آپ کو

اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کا تابع خیال کرے پھر یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو عاجز اور خدا تعالےٰ کو عزت والا سمجھے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کی نسبت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اُس نے عبادت کا مفہوم پالیا اور اُس کی عبادت درست ہوگئی۔

عبادت کی عملی صورت

شاہ عبدالعزیزؒ عبادت کی یہ تعریف بھی کرتے ہیں[1] کہ "عبادت در حقیقت مشغول کردن تمام اعضاء وجوارح ظاہر وباطن را در راہ او وبمرضیاتِ او" یعنی اپنے تمام اعضاء و قویٰ ظاہرہ اور باطنہ کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اُس کی مرضیات پر لگا دینے کا نام عبادت ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عبادت انسان کے ظاہری اعضاء سے بھی ہوتی ہے اور باطنی اعضاء سے بھی۔ مثلاً زبان کی عبادت یہ ہے کہ انسان قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے، اس کی تسبیح اور تہلیل بیان کرتا ہے، استغفار کرتا ہے، درود شریف پڑھتا ہے، دُعائیں کرتا ہے، کوئی بھی اچھا کلمہ زبان سے ادا کرتا ہے تو یہ سب زبانی عبادت شمار ہوتی ہے۔

آنکھ

آنکھ کی عبادت یہ ہے کہ انسان خانہ کعبہ کو دیکھے کیونکہ اَلنَّظْرَۃُ اِلَی الْکَعْبَۃِ عِبَادَۃٌ کعبہ شریف کو محض دیکھنا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ قرآن پاک اور دینی کتب کو دیکھنا، اللہ کے نیک بندوں کو تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دیکھنا۔ اللہ تعالیٰ کے نشانات کو اس لیے دیکھنا کہ اُس کی قدرت سمجھ میں آئے، سعدی صاحب کہتے ہیں کہ ہر درخت اور پودے کا ایک ایک پتہ پروردگار کی معرفت کا ایک دفتر ہے بشرطیکہ کوئی اس میں غور وفکر کرے۔ بہرحال اِن سب چیزوں کا دیکھنا آنکھ کی عبادت ہے

کان

اسی طرح کان کی عبادت یہ ہے کہ انسان قرآنِ پاک کو سُنے، وعظ ونصیحت کی بات کو سُنے تاکہ اللہ کی کتاب سمجھ میں آسکے، مسائل دینیہ کو سمجھنے کی غرض سے سنے۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۲

غرضیکہ ہر ایسی بات کا سننا جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو، اُس کی اطاعت کا جذبہ بیدار ہو اور دِل میں اُس کی یاد پیدا ہو، عبادت میں داخل ہے

ہاتھ اور پاؤں

اِسی طرح ہاتھ کی عبادت یہ ہے کہ انسان قرآنِ پاک اور دینی کُتب لکھے، اللہ تعالےٰ کے اسمائے پاک لکھے، غرضیکہ ہر ایسی تحریر جو عبد اور معبود کے درمیان تعلق استوار کرنے کا باعث ہو، ہاتھ کی عبادت میں شامل ہے۔ اَب اگر کوئی شخص اپنا پاؤں نیکی کے کام کے لیے اٹھاتا ہے تو یہ اس کے پاؤں کی عبادت ہوگی۔ جب کوئی شخص نماز کے لیے اٹھاتا ہے تو یہ اس کے پاؤں کی عبادت ہوگی۔ جب کوئی شخص نماز کے لیے مسجد کی طرف چلتا ہے تو اس کے ہر ہر قدم کے بدلے اُس کے نامہ اعمال میں نیکی لکھی جاتی ہے، اُس کے گناہ گرتے ہیں اور درجات بلند ہوتے ہیں، گویا ایک ایک قدم کے بدلے میں تین تین فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ حج کے لیے جانا، نیک لوگوں کی ملاقات کے لیے چلنا، جہاد اور تبلیغ کے لیے سفر اختیار کرنا، کسی کمزور کی مدد یا کسی کی استعانت کے لیے چل کر جانا، اچھے کام کی سفارش کے لیے کسی کے پاس جانا، سب پاؤں کی عبادت میں داخل ہے۔

اعضائے باطنہ

اعضائے باطنہ میں سے عقل کی عبادت یہ ہے کہ انسان قرآنِ کریم اور شریعت کے احکام میں غور و فکر کرے، اِن کو سوچے سمجھے اور پھر اُن پر عمل پیرا ہو جائے۔ اسی طرح نفس کی بھی عبادت ہے۔ سورۃ یوسف میں موجود ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ بیشک انسان کا نفس تو اُسے بُرائی پر آمادہ کرتا ہے، اس لیے نفس کی عبادت یہ ہے کہ انسان صبر کرے، نفس کو مالوفات اور مرغوبات سے روکے، شیطانی کاموں سے باز رکھے، روزہ رکھ کر کھانے پینے اور خواہشات سے روکے، اعتکاف بیٹھے تاکہ جھوٹی سچی خبروں کی وجہ سے ذہن میں پیدا ہونے والی پریشانی پر قابو پاسکے، ہر مصیبت

میں صبر کا دامن تھامے رکھے ، جزع فزع سے باز رہے ۔ محرمات اور معاصی سے روکے ہر خرابی پیدا کرنے والی بات سے ہٹائے ، غرضیکہ نفس کو تمام برائیوں سے باز رکھنا نفس کی عبادت ہے ۔

بہر حال اپنے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے تابع کر دینے کا نام ہی عبادت ہے ۔ بندے اور مالک کے درمیان تعلق کی درستگی ہی عبادت ہے اور اس میں قولی ، فعلی اور مالی ہر قسم کی عبادات شامل ہیں ۔ عبادت کے متعلق میں نے مختصر اور ضروری بیان عرض کر دیا ہے ۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④

ترجمہ :- (اے پروردگار) ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں ④

عبد اور معبود

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات بیان کرنے کے بعد اُسے براہِ راست خطاب کیا گیا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اے پروردگار! ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ ہم تیرے سوا کسی دوسری ذات کو مستحق عبادت نہیں سمجھتے کیونکہ عبودیت کے تمام شرائط تیری ذات کے علاوہ کسی دوسری ذات میں نہیں پائے جاتے تیرے سوا نہ کوئی خالق ہے اور نہ قادرِ مطلق، نہ کوئی واجب الوجود ہے اور نہ کوئی علیم کل، نہ کوئی نافع ہے اور نہ کوئی ضار۔ مخلوق میں سے کسی کی کوئی چیز ذاتی نہیں، حتیٰ کہ اُس کا وجود بھی خدا تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ذات کی کوئی چیز اپنی نہیں ہے اس میں الوہیت کی کوئی صفت ہی نہیں پائی جاتی تو وہ معبود کیسے ہو سکتی ہے؟ برخلاف اس کے مخلوق میں سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والی اور اسی کے دروازے کی سوالی ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں موجود ہے يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمان و زمین کی ہر چیز اُسی سے مانگتی ہے کیونکہ قادرِ مطلق وہی ہے۔ تمام اسباب پر کنٹرول اُسی کا ہے۔ متصرف فی الامور وہی ہے، لہٰذا اُس کے علاوہ عبادت بھی کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی ایسا کریگا تو وہ کفر اور شرک میں مبتلا ہوگا، اس آیت کریمہ میں یہی بات سمجھائی گئی ہے۔

مسئلہ استعانت اور شفا

اِس آیت کریمہ میں دوسرا مسئلہ استعانت کا بیان ہوا ہے۔ مافوق الاسباب استعانت بھی خدا تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے، اُس کے علاوہ کوئی بھی کسی کی مدد پہ قادر نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک دائرہ اسباب کا تعلق ہے، وہاں ایک دوسرے کی اعانت کا حکم دیا گیا ہے کہ ایک محدود دائرہ کار کے اندر ایک دوسرے کی مدد کرو، جیسا سورۃ مائدہ میں ارشاد ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى یعنی نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ اس کی تفصیل حضور علیہ السلام کے ارشاد مبارک سے ملتی ہے کہ اللہ کے بندو! جب تم بیمار ہو جاؤ۔ تو علاج کرو۔ بیماری میں علاج کرنے کی اجازت ہے کیونکہ جس اللہ نے بیماری کو پیدا کیا ہے اُس نے شفا کا سلسلہ بھی قائم کیا ہے اور اُسے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ حضور علیہ السلام نے دعا میں یہی بات سکھلائی ہے[1] کہ اے مولیٰ کریم لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ ــ شفا صرف تیری ہی شفا ہے تیرے بغیر کوئی بھی شفا دینے پر قادر نہیں لَا شَافِيَ اِلَّا اَنْتَ مالک الملک! تیرے بغیر کوئی بھی شفا دینے والا نہیں ہے۔ شفا جبھی ہوتی ہے جب تو شفا دینا چاہے کوئی ڈاکٹر کوئی حکیم، کوئی طبیب شفا نہیں دے سکتا۔

بعض لوگ سو فیصدی گارنٹی کے ساتھ علاج کرتے ہیں جو کہ جھوٹ محض ہے۔ شفا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ دوا یا کسی چیز میں بھی تاثیر تو اللہ کی پیدا کردہ ہے وہ جب چاہے اسے مؤثر کر دیتا ہے اور جب چاہے اس تاثیر کو روک لیتا ہے۔ لہٰذا شفا بھی منجانب اللہ ہے۔ سورۃ الشعراء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ بیان موجود ہے وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہی پروردگار مجھے شفا بخشتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک کے ڈاکٹر اور طبیب بھی علاج کرتے تھے مگر شفا منجانب اللہ

---

[1] بخاری صفحہ ۸۵۵ / ۲۶

ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ نسخہ تحریر کرنے سے پہلے هُوَالشَّافِي کے الفاظ لکھتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ بیشک ہم یہ دوا تجویز کر رہے ہیں مگر حقیقت میں شفا دینے والی ذات وہی ہے۔ جب تک خدا تعالیٰ دوا میں اثر نہیں ڈالے گا، شفا ممکن نہیں۔ مگر آج کل یہ سلسلہ بھی بند ہو چکا ہے۔ اب تو نسخہ بھی بسم اللہ کے بغیر ہی اُلٹے ہاتھ سے لکھ دیا جاتا ہے، ایسے نسخے اور ایسے علاج میں کیا برکت ہوگی؟ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بہت بڑا طبیب ہوں۔ لوگوں کا شرطیہ علاج کرتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] اَللّٰهُ الطَّبِيْبُ بَلْ اَنْتَ رَجُلٌ رَفِيْقٌ بھئی! تم طبیب کہاں ہو؟ طبیب تو خدا تعالیٰ کی ذات ہے، وہی شفا دیتا ہے، تم تو رفیق یعنی ساتھی ہو کر دوا تجویز کرتے ہو۔ شفا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

کوئی چیز مؤثر بالذات نہیں

ہر چیز کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور وہ جب چاہتا ہے اُس تاثیر کو روک لیتا ہے۔ لہذا کوئی چیز خود بخود مؤثر بالذات نہیں ہے۔ مثلاً آگ کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جلا ڈالتی ہے مگر جب اللہ تعالیٰ چاہے تو جلانے کی اُس تاثیر کو روک لے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ایسا ہی ہوا، تو معلوم ہوا کہ آگ میں جلا دینے کی تاثیر اُس کی ذاتی نہیں ہے اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ فلاں چیز کی فلاں تاثیر اُس کی ذاتی ہے، تو ایسا شخص شرک کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ یورپ کے بڑے بڑے سائنسدان مختلف شعبوں میں لاتعداد تجربات کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی چیز میں کوئی ذاتی تاثیر نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے ہیں کہ ضروری نہیں کہ جہاں علت ہوگی وہاں معلول بھی ہوگا، جہاں سبب ہوگا وہاں مسبب بھی ہوگا اور جہاں CAUSE ہوگا وہاں EFFECT بھی ضرور ہوگا بلکہ ہر علت، سبب اور CAUSE کسی مافوق الاسباب

---

[1] ابوداؤد ص ۲۲۲ ج ۲، مسند احمد ص ۱۶۳ ج ۴

ہستی کے حکم کا منتظر رہتا ہے کہ اگر حکم ہو تو آگے بڑھ کر اپنا کام کروں۔ پھر جب حکم ہوتا ہے تو سبب کا اثر ظاہر ہوتا ہے، ورنہ نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی بھی چیز مؤثر بالذات نہیں ہے، بلکہ اُس میں اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملتی ہے۔

حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان[1] ہے کہ سورج ہر روز سجدہ کرتا ہے۔ اس کی تشریح میں محققین، مفسرین اور محدثین بیان کرتے ہیں کہ سورج کے سجدہ کرنے سے ایسا سجدہ مراد نہیں جیسا ہم سجدہ کرتے ہیں، بلکہ اس کی صورت ایسی ہی ہو سکتی ہے جیسے ہم خواب میں کوئی کام کرتے ہیں حالانکہ ہمارا جسم تو چارپائی پر محوِ خواب ہوتا ہے اور اس کے ساتھ روحِ حیوانی بھی موجود ہوتی ہے مگر روحِ انسانی کہیں سے کہیں پہنچی ہوتی ہے۔ یہ کبھی خانہ کعبہ کا طواف کرتی ہے، کبھی کسی سے ملاقات کرتی ہے، کبھی مسجد میں نماز ادا کرتی ہے، جماعت میں شریک ہوتی ہے، قیام، رکوع اور سجدہ کرتی ہے تو سورج کا ہر روز سجدہ کرنا بھی اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

پھر یہ بھی آتا ہے کہ سورج ہر ہر قدم پہ اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو آگے بڑھوں، ورنہ وہیں رُک جاؤں۔ چنانچہ سورج اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ایک سمت کو رواں دواں ہے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا جب سورج آگے بڑھنے کی اجازت طلب کرے گا تو حکم ہوگا کہ اپنی معمول کی حرکت کو روک کر اُسے معکوس کردو۔ چنانچہ سورج کا سفر مشرق سے مغرب کی بجائے مغرب سے مشرق کی طرف شروع ہو جائے گا اور صبح سے دوپہر تک اُس کا یہ سفر جاری رہے گا۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی چیز میں اُس کا کوئی ذاتی تصرف نہیں ہے بلکہ کائنات

---

[1] بخاری صفحہ ۴۵۴/۱

کا ذرہ ذرہ اپنے پروردگار کے حکم کا منتظر رہتا ہے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے، گویا متصرف فی الامور صرف ذاتِ خداوندی ہے، باقی ہر چیز اس کے حکم کے تابع ہے۔

اسباب سے استفادہ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر عزیزی میں[1] حضرت سفیان ثوریؒ کے متعلق لکھا ہے کہ سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ تو غش کھا کر گر پڑے۔ لوگوں نے پوچھا حضرت کیا بات ہوئی۔ فرمایا جب میں نے اپنی زبان سے یہ ادا کیا کہ اے پروردگار! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں تو مجھے یکدم خیال آیا کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ تو اپنے دعوے میں جھوٹا ہے تو میرا کیا حشر ہوگا۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ تو فلاں کام کے لیے حاکم سے دوستی کرتا ہے، تنخواہ لینے کے لیے فلاں شخص کے پاس جاتا ہے اور شفا کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو تیرے دعویٰ میں صداقت کہاں رہ گئی، تو نے تو اسباب کو مؤثر سمجھ لیا۔ فرماتے ہیں کہ یہ خیال آتے ہی مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔

یہ تو اُن کے تقوے کی بات تھی۔ مگر ظاہری اسباب کو ترک کرنے کی بھی اجازت نہیں بلکہ عالمگیری میں یہ فتویٰ موجود ہے کہ ظاہری اسباب ترک کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص بوقت ضرورت اِن اسباب سے مستفید نہیں ہوتا اور مرجاتا ہے تو وہ مردار کی موت مرے گا بھوک کو مٹانے کے لیے کھانا کھانا ضروری ہے، تشنگی کو رفع کرنے کے لیے پانی پینا لازم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اِن اسبابِ ظاہرہ کو اختیار نہیں کرتا تو وہ قابلِ مواخذہ ہوگا۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اِن اسباب کو مؤثر بالذات نہ سمجھے بلکہ خالص اللہ تعالےٰ

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صہ ۸

پر بھروسہ کرتے ہوئے اِن کو استعمال کرے۔ کیونکہ اِن اسباب میں تاثیر پیدا کرنا اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔ اگر کھانے میں بھوک مٹانے کی ذاتی تاثیر ہوتی تو لوگ جوع الکلب کی بیماری میں مبتلا نہ ہوتے جس میں زیادہ سے زیادہ کھانے سے بھی پیٹ نہیں بھرتا بلکہ بھوک بدستور قائم رہتی ہے۔ بھوک کو روٹی نہیں مٹاتی بلکہ اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے۔ البتہ بعض اسباب ایسے ہیں جن کے متعلق یقین نہیں ہوتا بلکہ محض گمان ہوتا ہے کہ اِن سے فائدہ ہوگا۔ جیسے بیماری میں علاج کا معاملہ ہے کہ اس میں صحت یابی کا یقین نہیں ہوتا کیونکہ شفا من جانب اللہ ہے۔ لہٰذا علاج کرنا مسنون یا مستحب تو ہے مگر ضروری نہیں، اسی لیے بعض کامل درجے کے لوگ ایسے اسباب بھی اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ البتہ عام لوگوں کے لیے یہی حکم ہے کہ اِن اسباب کو اختیار کریں۔ بعض اسباب موہوم قسم کے ہیں جیسے جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈا وغیرہ اِن کو ترک کر دینا ادنیٰ قسم کے توکل میں داخل ہے۔

عبادات میں استغراق

ہماری عبادات میں عام طور پر استغراق نہیں پایا جاتا اکثر طبیعتوں پر وہم چھائے رہتے ہیں، وسواس ہوتے ہیں، الفاظ کی ادائیگی بھی صحیح نہیں ہوتی، کئی خامیاں رہ جاتی ہیں، اس لیے ہزاروں میں کوئی اکا دکا آدمی ایسا ہوگا جس کی نماز صحیح ہو۔ کسی شخص نے حضرت مولانا حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی ؒ سے عرض کیا، حضرت! مجھے نماز کے دوران خیالات بہت آتے ہیں، آپ نے فرمایا، آتے رہیں مگر تم نماز کو ترک نہ کرو کہ ہمارے لیے یہی حکم ہے۔ اپنے طور پر کوشش کرو کہ خیالات کم سے کم آئیں مگر اس میں عام طور پر کامیابی نہیں ہوتی۔ تاہم اللہ کے کامل بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ نماز میں مکمل استغراق حاصل ہوتا ہے اور انہیں اپنے ماحول کی خبر تک نہیں ہوتی ابوداؤد شریف میں ایک صحابی کا ذکر ہے[1] جو رات کو پہرہ دے رہا تھا۔ اس دوران اس نے نماز شروع

---

[1] ابوداؤد ص ۲۶ ج ۱

کردی۔ اتنے میں دشمن کی طرف سے تیر آیا۔ جو صحابی کے جسم میں پیوست ہوگیا۔ آپ نماز میں اس قدر منہمک تھے کہ جسم کا خون بہ جانے کے باوجود انہیں محسوس بھی نہ ہوا کہ اُن کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔

اِسی قِسم کا ایک واقعہ امام اَبُوحنیفہؒ کا بھی آتا ہے[1]۔ آپ باقی لوگوں کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک سانپ چھت سے گر پڑا۔ سب لوگ بھاگ گئے مگر امام صاحب نماز میں اس قدر مشغول تھے کہ آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیا ہوگیا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ مشہور تابعی اور مدینہ کے سات چوٹی کے فقہا میں سے ہوئے ہیں۔ آپ بڑے پائے کے عالم اور کمال درجے کے عبادت گزار تھے۔ آپ کے پاؤں میں زخم آگیا لوگ آپریشن کرنا چاہتے تھے مگر آپ اِس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آخر جب وہ نماز میں منہمک ہوگئے تو آپ کے پاؤں کا آپریشن کر دیا گیا[2]۔ آپ عبادت میں اس قدر مستغرق تھے کہ آپریشن کا پتہ تک نہ چلا۔

عبودیت کے اثرات

عام لوگوں پر عبودیت کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے کیونکہ وہ عبادت کی شرائط پوری نہیں کرتے۔ ہماری نمازیں اکثر اوہام کا شکار ہوتی ہیں لہٰذا عبادت کے اثرات بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ اللہ کی عبادت اچھے طریقے سے کرتے ہیں، ان پر عبودیت اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں اور اُن سے کرامت کا ظہور بھی ہونے لگتا ہے۔ عبودیت کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو نیکی کی توفیق مسلسل ملتی رہتی ہے۔ اگر اُس میں عبادت کا ذوق وشوق بڑھ رہا ہے تو سمجھ لو کہ نیکی کی مزید توفیق مِل رہی ہے اور اس پر آثارِ عبودیت ظاہر ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص نیکی کے کام کرنے سے رُک گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے نیکی کی توفیق ہی سلب کر لی گئی ہے

---

[1] تفسیر کبیر للامام رازیؒ ج۱ ص۲۴۹ [2] تفسیر کبیر ج۱ ص۲۴۹

ایسے شخص پر عبودیت کے کیا آثار ظاہر ہوں گے ؟

بزرگانِ دین کے تذکرے میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے کہ جن کی ظاہری حالت تو کچھ نہیں ہوتی مگر عبادت کی روح کو پالینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے مقربین میں شامل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بزرگوں میں شیبان راعی ہیں۔ بڑے نیک، عابد اور زاہد تھے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے ہم عصر تھے اور یہ دونوں بزرگ شیبان راعیؒ کی مجلس میں بیٹھ کر سکون حاصل کرتے تھے۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ بڑے صاحبِ علم لوگ ہیں، محدث، فقیہ اور مجتہد ہیں مگر بکریاں چرانے والے ایک ایسے شخص کی مجلس میں جاتے ہیں جو بالکل ان پڑھ ہے۔ نہ کسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے اور نہ کوئی سند رکھتے ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس چرواہے کو وہ چیز عطا کی ہے جو ہمارے اندر نہیں پائی جاتی، لہٰذا ہم اس کی مجلس میں جا کر بیٹھتے ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی اپنے پیر و مرشد کی مجلس کا ذکر کرتے ہیں جن کے ہاتھ پر وہ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں ان کی مجلس کا اثر کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ اپنی مجلس میں جن کلمات یا کلمۂ توحید کی تلقین فرماتے تھے، جو وعظ و نصیحت کرتے تھے یا وظائف بتلاتے تھے، اس کا اثر فوراً طبیعت پر ہو جاتا تھا۔ آپ کے بعد میں نے یہ اثر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مجلس میں دیکھا ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبد الحیؒ (داماد شاہ عبد العزیزؒ) سید احمد شہیدؒ کے ساتھ معرکہ بالاکوٹ میں شریک تھے کسی نے کہا کہ آپ تو بڑے پائے کے عالم ہیں، آپ کی بہت سی تصانیف موجود ہیں مگر آپ نے ایک ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت کی ہے جو زیادہ علم نہیں رکھتا۔ کہنے لگے، تم نہیں جانتے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا ہے وہ ہمارے پاس کہاں

ا

ہے۔ سیّد صاحب کی تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اُن پر بڑا فضل فرمایا تھا۔ اور اُن کو اعلیٰ درجے کی روحانیت عطا کر رکھی تھی۔ اِسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بڑے پائے کے عالم اور بزرگ تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے حالانکہ وہ زیادہ علم نہیں رکھتے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ حاجی صاحب کے پاس ظاہری علم کم ہے مگر ہم نے اِن کی بیعت اس لیے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حرارت اُن کے قلب میں پیدا کی ہے، وہ ہمارے اندر کہاں ہے؟ ہم تو وہ حرارت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے قلب میں ہے۔

حضرت عبدالعزیز دباغؒ بھی نویں دسویں صدی کے بہت بڑے بزرگ ہوئے ہیں۔ بظاہر ان پڑھ تھے مگر اُن کے ملفوظات اُن کے شاگرد مبارکؒ نے اپنی کتاب الابریز میں جمع کیے ہیں۔ جب بھی آپ سے قرآن و حدیث کے متعلق کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو توفیق ایزدی سے بالکل صحیح صحیح جواب دیتے[1]، اللہ تعالیٰ نے ایسی روحانیت اور ملکہ عطا فرمایا تھا۔

شیبان راعیؒ جن کا ابھی ذکر ہوا، جنگل میں بکریاں چراتے تھے، اس دوران جنابت کی حالت لاحق ہوگئی۔ مگر غسل کے لیے پانی نہیں تھا اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا، پروردگار! میں تیرا عاجز بندہ ہوں، سوائے تیرے میرا کوئی آسرا نہیں، مجھے نماز پڑھنا ہے مگر طہارت کی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ اتنا عرض کرنا تھا کہ بارش شروع ہوگئی، آپ نے غسل کر کے نماز ادا کی۔ آپ ہی کے متعلق ذکر آتا ہے کہ جب جمعہ کا دن آتا تو بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے، مولا کریم! شہر میں

لہ

میں جاکر جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے۔ مگر بکریوں کی دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ پھر خود ہی بکریوں کو ایک جگہ جمع کرکے اُن کے اردگرد ایک دائرہ کھینچ دیتے اور جمعہ کے لیے چلے جاتے اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت کرتا اور کوئی بکری دائرے سے باہر نہ نکلتی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عبودیت کے اثرات بعض لوگوں پر ظاہر ہوجاتے ہیں مگر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ساری عمر نہایت انہماک کے ساتھ عبادت کرتے ہیں مگر کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ آثار کا اظہار بھی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ چاہے تو ظاہر کرے اور اگر نہ چاہے تو نہیں ہوتے بہرحال اللہ کے بندے ایسے ہمیشہ رہے ہیں جو اللہ پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔ خالص اسی کی عبادت کرتے ہیں، شرک سے سخت بیزار رہتے ہیں اور ان پر عبودیت کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں جیساکہ ان بزرگوں کے واقعات سے پتہ چلتا ہے

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ایک دفعہ دل میں خیال کیا کہ رات کو دو رکعت ایسی نماز پڑھوں جس کے دوران وسواس نہ آئیں۔ کہتے ہیں کہ میں نے سو رکعت نماز ادا کی مگر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ صبح کے وقت اپنے پیر و مرشد سید احمد شہیدؒ کے سامنے ذکر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے میرے پیچھے صرف دو رکعت ادا کرلو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اِن دو رکعتوں کے دوران ایسی کیفیت پیدا کردی کہ ہمیشہ کے لیے نماز میں حضورِ قلب حاصل ہوگیا۔

حقیقت معجزہ و کرامت

یہ عبودیت کے آثار ہیں جو اللہ کے نیک بندوں پر ظاہر ہوتے ہیں مگر اکثر لوگ یہاں پر غلطی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کسی بزرگ کی کرامت دیکھی تو اسے بزرگ کا ذاتی فعل سمجھ کر اُس کی پوجا شروع کردی حالانکہ درحقیقت نبی کا معجزہ اور ولی کی کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ اس کو ذاتی سمجھ کر ہی لوگ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ نصاریٰ نے

مسیح علیہ السلام کے معجزات دیکھے تو انہیں خدا بنا دیا۔ اللہ کے ولی کی کرامت دیکھ کر لوگ انہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں کہ یہی لینے دینے والے ہیں حالانکہ وہ اللہ کا بندہ تو آثار عبودیت میں ہوتا ہے۔ اللہ چاہے تو کوئی چیز ظاہر کر دے اور نہ چاہے تو نہ کرے وہ مالک ہے، نہ چاہے تو نبی کی دعا بھی جلدی قبول نہ کرے۔ حضرت موسیٰ اور ھارون علیہما السلام کی دعا چالیس سال کے بعد قبول ہوئی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ کی دعائیں کبھی فوراً قبول ہو گئیں، کبھی دیر سے اور کبھی قبول نہیں ہوتیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے، لوگ یہیں پر آکر غلطی کرتے ہیں، وہ اللہ کے فعل کو بندے کی طرف منسوب کر کے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝۵

دکھلا ہم کو سیدھا راستہ ۝۵

اللہ کی شرط

گذشتہ دروس میں عبادت و استعانت کا بیان تھا اور میں نے ان کا مفہوم عرض کر دیا تھا کہ عبادت کا تعلق تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے اور اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جو عبادت کے لائق ہو۔ جہاں تک استعانت کا تعلق ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی شرط ہے۔ مدد کرنا اُسی ذات وحدہٗ لاشریک کا کام ہے اس کے علاوہ مافوق الاسباب مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر[1] میں ایک واقعہ قلمبند کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اونٹ پر سوار ایک دیہاتی مسجد نبوی میں آیا۔ اونٹ کو باہر چھوڑا اور خود مسجد میں آکر اطمینان سے نماز ادا کی۔ پھر جب فارغ ہو کر باہر نکلا تو اونٹ موجود نہیں تھا۔ کہنے لگا، اے پروردگار! میں نے نماز ادا کر کے اپنی شرط پوری کر دی ہے، اب مدد کرنا تیری شرط ہے لہٰذا تو بھی اونٹ کے معاملے میں میری مدد فرما کر اپنی شرط پوری کر۔ کہتے ہیں کہ ابھی وہ دیہاتی دعا کر ہی رہا تھا کہ ایک شخص اونٹ کی نکیل پکڑے اُس کے پاس پہنچ گیا حالانکہ اُس شخص کا اپنا ہاتھ کٹا ہوا تھا بہر حال امام صاحب نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا انسان کا کام ہے اور مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی شرط ہے۔ جب کوئی شخص اپنی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کر لیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اُسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا

صراط مستقیم

سب سے پہلے بندوں نے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی کہ تمام تعریفیں

---

[1] تفسیر کبیر ص ۲۴۹ ج ۱

اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، وہ از حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ پھر نہایت خلوص کے ساتھ عرض کیا، اے مولا کریم! ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ اب یہاں سے دُعا کی ابتداء ہو رہی ہے۔ اللہ کے بندے اُس کے حضور عرض کرتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ دکھلا ہم کو سیدھا راستہ۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اس کی تشریح خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ اس راستے سے مراد اسلام، دین اور توحید کا راستہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پہ اللہ کے تمام انبیاء علیہم السلام گامزن رہے۔ سورۃ الحجر میں جہاں ابلیس نے انسانوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکانے کا چیلنج کیا ہے، وہاں اللہ نے فرمایا ہے هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ یہی سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے، اس کے اصول و ضوابط قرآن پاک میں تبلا دیے گئے ہیں اور اس راستے پہ چلنے والے مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی داؤ کامیاب نہیں ہو سکے گا، یہ وہی راستہ ہے جو اللہ کی رضا اور اس کے قرب کے مقام تک پہنچانے والا ہے آگے سورۃ نحل میں آتا ہے وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے وَمِنْهَا جَآئِرٌ اور بعض ٹیڑھے راستے بھی ہیں جن پر چل کر کوئی شخص منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، یہ کفر و شرک کے شیطانی راستے ہیں، شیطان لوگوں کو ان راستوں کی طرف لے جانا چاہتا ہے مگر اسلام، دین حق اور توحید کا یہی صراطِ مستقیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔

سورۃ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دینِ برحق صرف اسلام ہے۔ جو اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت

کا راستہ ہے، تمام انبیاء، ملائکہ اور نیک لوگ یہی راستہ اختیار کرتے آئے ہیں۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اللہ نے واضح طور پر فرمادیا ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران) جو آدمی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے گا تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ اور ایسا شخص آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والا ہوگا۔ وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا، بلکہ خدا تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوکر جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا انسان کا فطری حق ہے۔ جو شخص اِن فطری تقاضوں کے مطابق چلے گا، فرائض کو ادا کرے گا، نواہی سے پرہیزگاری کرے گا، وہی صراطِ مستقیم کا مسافر ہوگا۔ اور یہ وہی راستہ ہے جس کی تعلیم و تلقین تمام انبیاء کرتے آئے ہیں، لہٰذا انسان اللہ کے حضور عرض کرتے ہیں کہ مولا کریم! ہمیں اس صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرما جس پر چل کر انسان بالآخر جنت میں پہنچ جائے۔

اولین استعانت

صراطِ مستقیم کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر ابتداء کی طرف لوٹتے ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے اور اس کے اسمائے پاک کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو سب سے پہلے کون سی استعانت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ تو بہرحال ذرے ذرے کو جانتا ہے مگر انسانوں کے اذہان میں یہ بات آسکتی ہے کہ انہیں سب سے پہلے کس استعانت کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر بھی خود اللہ تعالیٰ نے اُن کی راہنمائی فرمائی ہے اور اُن کی زبان سے کہلوایا ہے کہ مولا کریم! سب سے پہلے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہمیں سیدھا راستہ دکھلا گویا انسان کی اولین ضرورت صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔

قوائے عقل و فہم

اَب سیدھے رستے کو پہچاننے اور اس پر گامزن ہونے کے لیے بعض قوی کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا انسان اللہ تعالیٰ سے اُن قوتوں کا فیضان طلب کرتے ہیں۔ جن کے ذریعے وہ سیدھے اور ٹیڑھے راستے میں امتیاز کر سکیں۔ اس کے لیے عقل، وہم اور حواسِ ظاہرہ و باطنہ کی ضرورت ہے۔ اگر عقل ہی نہ ہو تو نہ تو انسان مکلف ہو سکتا ہے اور نہ ہدایت پا سکتا ہے۔ لہٰذا انسان اللہ تعالیٰ سے عقل و فہم کی درخواست کرتے ہیں۔ پھر حواس ظاہرہ ہیں جو حصولِ علم کے ذرائع ہیں۔ اگر انسان کو آنکھ اور کان جیسی عظیم نعمت حاصل نہ ہو تو انسان علم حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی صراطِ مستقیم کی پہچان کر سکتا ہے اسی طرح سونگھنے، ٹٹولنے اور چکھنے کے ظاہری حواس ایسے ہیں جن کے بغیر انسان بہت سی چیزوں سے محروم ہو جاتے ہیں، لہٰذا انسان ان تمام حواس ظاہرہ کے لیے اللہ کے حضور درخواست کرتے ہیں۔ حواس ظاہرہ کے علاوہ حواس باطنہ مثلاً حسِ مشترک، خیال، وہم، قوتِ متفکرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ حق و باطل کی پہچان کے لیے ان کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا انسان یہ دُعا کرتے ہیں کہ ہمیں یہ تمام چیزیں عطا کر دے جو ہماری ہدایت کا ذریعہ بن سکیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی چیز کو کماحقہ سمجھنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر بھی کسی چیز کا مکمل ادراک حاصل نہیں ہو سکتا۔ تو اس دُعا میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مولا کریم! ہمارے لیے ایسے دلائل قائم کر دے جن کے ذریعے ہم حق و باطل میں امتیاز کر سکیں اور صراطِ مستقیم کو اختیار کر سکیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سُورۃ بلد میں یہ بات پہلے ہی واضح کر دی ہے کہ ہم نے انسان کو پہلے پیدا کیا، اُسے دو آنکھیں دیں، زبان اور دو ہونٹ عطا کیے وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ اور اُسے نیکی اور بدی کی دونوں گھاٹیوں کا علم بھی دے دیا، خیر و شر کا فلسفہ سمجھا دیا کہ یہ راستہ نیکی کی طرف جاتا ہے اور یہ بُرائی کی طرف اور پھر انسان کو اختیار دیدیا کہ وہ اپنے قوائے ظاہرہ و باطنہ

کو بروئے کار لائے اور خیر و شر میں سے کوئی سا راستہ اختیار کرے۔ مقصد یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کو اختیار کرنے کے لیے جن قویٰ کی ضرورت ہوتی ہے، انسان اللہ تعالیٰ سے اُن کی درخواست کرتے ہیں کہ پروردگار! ہمیں یہ چیزیں عطا کردے تاکہ ہم تیرے صراطِ مستقیم کو پہچان کر اُس پر گامزن ہو سکیں۔

رسول اور کتب

علم کا اولین ذریعہ وحی الٰہی ہے جو اللہ کے رسولوں پر آتی ہے۔ چنانچہ صراطِ مستقیم کی راہنمائی کے لیے رسولوں کا آنا بھی ضروری ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ارسالِ رُسل اُس کی صفت ہے۔ سورۃ السجدہ میں موجود ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا ہم نے رسولوں کو امام اور پیشوا بنا کر بھیجا تاکہ وہ ہمارے حکم کے مطابق انسانوں کی راہنمائی کر سکیں۔ یہ تمام انبیاء کا کام رہا ہے کہ وہ اپنی امتوں کو صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، لہٰذا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ میں اللہ تعالیٰ سے رسول مبعوث کرنے کی دُعا بھی شامل ہے۔

ہدایت کے لیے آسمانی کتابوں کی بھی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر کتابیں نازل فرمائیں۔ سورۃ شوریٰ میں موجود ہے، اللہ نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ آپ کہ دیں کہ میرا اُن تمام کتابوں پر ایمان ہے جو اللہ نے نازل فرمائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے حضرت شیث علیہ السلام کے صحیفوں سے لے کر زبور تک صحائف اور کتابیں نازل فرمائیں اور پھر آخر میں قرآن پاک کو نازل فرما کر ہدایت کو مکمل کر دیا۔ اگرچہ سابقہ کتب میں اُن کے پیروکاروں FOLLOWERS نے تغیر تبدل بھی کر دیا۔ اُن میں غلط باتیں بھی داخل کر دیں مگر اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا سامان نازل فرما کر حجت تمام کر دی۔ یہ صرف قرآن پاک کو شرف حاصل ہے کہ قیامت تک یہ تحریف سے پاک رہے گا اس کے متعلق اللہ نے

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ بیشک یہ قرآنِ حکیم سب سے سیدھے راستے اور سب سے سیدھی ملت کی طرف راہنمائی کرتا ہے

بہر حال اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں یہ ساری باتیں شامل ہیں کہ اے مولا کریم! ہمیں ایسی قوتیں عطا فرما ایسے دلائل سمجھا جو تیرے راستے کی طرف راہنمائی کر سکیں۔ نیز اپنے انبیاء اور کتابوں کے ذریعے ہمیں سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرما۔

اسرار و معارف

اس دعا میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اے خداوند قدوس! ہمارے دلوں میں ایسے اسرار و معارف منکشف کر دے جن کے ذریعے ہم اشیاء کو ان کی اصلی حالت میں دیکھ سکیں ایک دعا میں یہ الفاظ آتے ہیں اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ اے اللہ ہمیں چیزوں کو اس طرح دکھا جیسا کہ وہ واقع میں ہیں بعض اوقات کسی چیز کو دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی لگتی ہے۔ پیغمبر کی ذات کے سوا کوئی انسان بھی غلطی سے خالی نہیں بعض اوقات کوئی چیز دیکھنے میں، بعض اوقات سمجھنے میں، بعض اوقات اخذ کرنے میں اور بعض اوقات بیان کرنے میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کی جاتی ہے کہ مولا کریم! ہمارے دلوں کو اسرار و معارف کے لیے کھول دے تاکہ ہم ہر چیز کو اس کی اصلی حیثیت میں جان اور پہچان سکیں کیونکہ یہ چیز بھی ہدایت میں داخل ہے۔

اس کے علاوہ وحی الٰہی، الہام اور سچے خوابوں کے ذریعے بھی ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ وحی تو صرف انبیاء پر آتی ہے۔ البتہ الہام انبیاء اور غیر انبیاء کو بھی ہوتا ہے۔ اور رویا صادقہ (سچے خواب) ہر ایماندار کو آسکتے ہیں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ خواب کے ذریعے بھی بعض چیزیں منکشف کر دیتا ہے۔ یہ سب ہدایت کے ذرائع ہیں اور سیدھے راستے کی تلاش میں انسان بالواسطہ ان سب چیزوں کی درخواست کرتا ہے۔

ہدایت کا بہترین طریقہ

انسان جس ہدایت کا طالب ہے اس سے مراد ایسی اچھے طریقے سے راہنمائی

ہے جس میں نرمی اور لطافت ہو اور جس میں سختی اور درشتگی نہ ہو۔ ہدایت دو طریقے سے ہو سکتی ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ جس شخص کو راستہ معلوم نہیں ہے، کوئی دوسرا شخص اس کو دور سے راستہ دکھا دے کہ بھئی یہ راستہ تمہاری منزلِ مقصود کی طرف جاتا ہے اسے ارأة الطریق کہتے ہیں۔ جب انسان قرآن کریم کی تلاوت کی ابتداء کرتا ہے تو وہ اسے پہلے ہی دِن صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرآنِ پاک اپنے قاری کو کہتا ہے کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔ اُسے اصول وضوابط سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ سیدھے اس راستے پر چلنا۔ اس کے دائیں بائیں کچھ پگڈنڈیاں ہیں، اِن پر نہ چلنا ورنہ دُور نکل جاؤ گے اور منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکو گے۔ مطلب یہ کہ قرآن پاک پہلے ہی دِن منزلِ مقصود ہی کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے۔

ہدایت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ کسی شخص کی راہنمائی اس طریقے سے کی جائے کہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا جائے اسے ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔ ہدایت اور راہنمائی کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

طلب صراط پر اعتراض

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان ساری ساری عمر صراط مستقیم کی دُعا کرتے رہتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں عمر بھر سیدھا راستہ نہیں ملتا۔ یہی اعتراض دیانند سرسوتی آریہ سماجی نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے سامنے پیش کیا تھا۔ بعض عیسائی اور دیگر متعصب قسم کے لوگ بھی ایسا اعتراض کرتے ہیں مگر یہ نامعقول اعتراض ہے۔ اِھْدِنَا کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کا معنی دکھانا بھی ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچانا بھی۔ اس کا معنی ثابت قدم رکھنا بھی آتا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادرؒ نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے "چلا ہم کو سیدھے راستے پر" محض دکھانا نہیں بلکہ چلانا مقصود ہے۔ امام ابن جریرؒ[1] اسی

---

[1] تفسیر طبری ص ۷۴ ج ۱

کا ترجمہ کرتے ہیں وَفِّقْنَا وَ ثَبِّتْنَا اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی توفیق عطا فرما اور پھر اس پر ثابت قدم رکھ۔ راستہ معلوم ہو جانے کے بعد اُس پہ ثابت قدم رہنا بھی ضروری ہے۔ گویا یہ لفظ وسیع معنوں میں آیا ہے اور یہاں یہ سارے ہی معانی مراد ہیں۔

ثابت قدمی اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ راستہ معلوم ہو جانے کے باوجود اُس سے بھٹک جاتے ہیں۔ غلام احمد پرویز، مرزا قادیانی اور بعض دیگر گمراہ فرقے ہیں جو راستہ معلوم ہونے کے بعد گمراہی میں پڑ گئے۔ لہٰذا انسان ہر وقت یہ دُعا کرتا ہے کہ مولا کریم! ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اس راستے پہ ثابت قدم رکھ جو ایمان اور توحید کا راستہ ہے، جو دینِ اسلام اور دین توحید کا فطری راستہ ہے پر مستمر رکھ تاکہ ہمارے پاؤں میں لغزش نہ آنے پائے۔ اس راستے کو ہمارے لیے قائم و دائم رکھ اور ہمارے لیے اس راستے کی ہدایت میں اضافہ فرما۔ قرآن پاک میں موجود ہے زِدْنٰهُمْ هُدًى ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ پہلے علم کم ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں انسان ترقی کرتا جاتا ہے اس کی ہدایت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مفسر قرآن مولانا شاہ اشرف علیؒ تھانویؒ فرماتے ہیں کہ طلب ہدایت ہر درجے اور مرتبے کے مطابق جاری رہنی چاہیئے۔ جب کوئی انسان کسی خاص مرتبے تک پہنچ جاتا ہے تو اُس کا سفر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اُسے اگلے مرتبے تک پہنچنے کے لیے اپنی تگ و دو اور سفر جاری رکھنا چاہیئے۔ اُسے ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیئے مولانا رومیؒ نے یہ بات اس طرح سمجھائی ہے ؎

اے برادر! بے نہایت درگہے است

ہر کہ بروے میرسی بروے مائیست

اے بھائی! اللہ کی بارگاہ بے انتہا ہے، لہٰذا ہدایت کے جس مرتبے پر بھی پہنچو اس

سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ پروردگار! مجھے اگلا مرتبہ عطا فرما۔ انسان کو ہر وقت ہر اُوپر والے درجے کی درخواست کرنی چاہیئے۔ لہٰذا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا اور یہ دُعا اہل ایمان کی زبان پر عمر بھر جاری رہتی ہے۔

مادی اور روحانی راستے

صراطِ مستقیم پر استقامت سے یہ بھی مراد ہے کہ جس راستے پر کوئی شخص گامزن ہے وہ آسان، قریب اور محفوظ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی مادے راستے پر سفر کرنا چاہے تو وہ ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جو حتی الامکان قریب ہو، سیدھا ہو اور صاف بھی راستے میں کانٹے یا پتھر نہ ہوں اور یہ ٹیڑھا بھی نہ ہو۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں "رہ راست بہ گرچہ دور است" سیدھا راستہ پکڑو اگرچہ مسافت میں کچھ دور ہی کیوں نہ ہو تاکہ بھٹکنے سے محفوظ رہ سکو۔ ہمیشہ ایسے راستے کی تلاش ہوتی ہے جو دیگر باتوں کے علاوہ مامون بھی ہو یعنی اس راستے سے کسی چور، ڈاکو یا راہزن کا خطرہ نہ ہو۔ یہ ایسا راستہ ہو جس پر سفر کے دوران کوئی مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ اور آدمی آسانی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

اسی طرح روحانی راستے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ خطرات سے خالی ہو۔ ایسے راستے پر شیطان انس اور جن ہوتے ہیں جو اس راستے کے مسافروں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور انہیں صحیح راستے سے بھٹکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا دُعائے استقامت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مولا کریم! ہمیں ایسے راستے پر چلا جو روحانی ڈاکوؤں سے مامون ہو۔ استقامت زبان سے بھی ہوتی ہے قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (الاحزاب) منہ سے ٹھیک بات کرو قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا لوگوں سے اچھی بات کہو، یہ بھی صراطِ مستقیم پر استقامت ہے۔ اسی طرح عقائد اور اعمال میں بھی استقامت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عقیدے اور عمل میں کوئی غلط چیز شامل نہ ہو سکے، عقیدے

میں کفر، شرک اور نفاق کی ملاوٹ ہو سکتی ہے جب کہ اعمال میں ریا شامل ہو جاتی
ہے، لہذا یہ دُعا اِن تمام اُمور پر مشتمل ہے۔ جب انسان سیدھے راستے کی دُعا کرتا ہے
تو کہتا ہے کہ پروردگار! ہمیں صحیح راستہ دکھا، اس پر چلا اور اس پر استقامت
عطا فرما۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵

ترجمہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر تونے انعام فرمایا

ربط آیات

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد اُسی کی عبادت کرنے اور اُسی سے استعانت کا بیان ہوا۔ پھر اُس کے سامنے دستِ سوال دراز ہوا۔ کہ مولا کریم! ہماری راہنمائی فرما، ہمیں سیدھے راستے پر چلا اُس پر ثابت قدم رکھ۔ صراطِ مستقیم کی مختصر تشریح بیان ہو چکی ہے اور اب اگلا جملہ بھی سابقہ آیت ہی کے تسلسل میں ہے اور اسکی مزید وضاحت کرتا ہے۔ یعنی پروردگار! ہمیں اس صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ جو ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تونے انعام فرمایا۔

نمونہ کی ضرورت

یہ ایک واضح اصول ہے کہ انسانی سوسائٹی میں انسان کی فطری قوتوں کی تکمیل اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اُس کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہ ہو۔ اِس نمونے کو دیکھ کر ہی انسان اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے اپنی زندگی کو نمونہ کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ چنانچہ ہم قرآن پاک میں پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو امت کے لیے ایک نمونہ بنا کر مبعوث فرمایا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب) بیشک اللہ کے رسُول تمہارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ خطبہ جمعہ میں بھی آپ سُنتے رہتے ہیں خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سب سے بہتر طریقہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو تمہارے لیے بطور نمونہ ہے۔ آپ کی سیرت بہترین سیرت ہے بلکہ ہر نبی اپنے اپنے دور میں امت کے لیے بطور نمونہ ہوتا ہے۔ ان کے بعد اللہ کے کامل بندے اولیاء اللہ دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں عام

لوگ انہی کے طریقے پر چل کر اپنی قوتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ غرضیکہ انسانی سوسائٹی میں نمونے کا ہونا بہت ضروری ہے، چنانچہ صراطِ مستقیم کی تشریح میں اسی نمونے کا ذکر کیا گیا ہے یعنی رب العزت! ہمیں اُن لوگوں کے نمونے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا۔

اب مادی انعامات تو عام ہیں اور دنیا میں ہر شخص پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جن انعامات کا ذکر اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے اِن سے مراد دینی اور روحانی انعامات ہیں۔

دینی انعام

اولین دینی انعام قرآن پاک کا راستہ ہے اور یہ وہی راستہ ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے۔ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں حضور علیہ السلام کا اسوہ حسنہ موجود ہے۔ مفسر قرآن ابو العالیہؒ فرماتے ہیں[1] کہ انعام یافتہ لوگوں کے راستے سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ ہے اور آپ کے بعد آپ کے دونوں ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ہیں کیونکہ آپ کا اپنا فرمان[2] ہے اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنِ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍؓ وَّ عُمَرؓ یعنی میرے بعد اِن دو حضرات کی اقتدا کرو، کیونکہ اِن کا طریقہ میرا طریقہ ہے اور پھر باقی سارے صحابہؓ اِن دو کے تابع ہیں۔ اُن کے بعد باقی خلفائے راشدین کا نمبر آتا ہے، وہ بھی امت کے لیے بطور نمونہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جس خلافت کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد انہی چاروں خلفائے راشدین کی خلافت ہے اور پھر ان چار میں سے پہلے دو حضرات کا نمونہ کمال درجے کا ہے اور سب سے پہلے درجے میں کامل نمونہ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مبارکہ ہے جیساکہ قرآن مجید میں مذکور ہے

روحانی انعام

روحانی انعامات میں سے بعض تو انسان خود اپنی محنت سے کماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بخشش اور فیضان سے بھی انعام حاصل ہوتا ہے۔ انسانی جسم میں روحِ انسانی

---

[1] تفسیر طبری ص ۷۵/۱ ۔ [2] ترمذی ص ۲۰۷/۲

اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔ روحِ حیوانی تو قرارِ حمل کے ساتھ پہلے دِن سے اپنا کام شروع کر دیتی ہے مگر روحِ انسانی جو انسان کے قلب میں چوتھے مہینے میں ڈالی جاتی ہے اس کا نمونہ علیین یا خطیرۃ القدس سے آتا ہے۔ صحیح احادیث میں آتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔ پھر انسان کو عقل عطا کرنا اور تمام ظاہری و باطنی قوتوں سے لیس کرنا، غور و فکر کی طاقت بخشنا اور خاص طور پر گفتگو کا طریقہ سکھلانا اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعامات ہیں۔ چنانچہ یونانی فلسفی انسان کو حیوانِ ناطق یعنی بولنے والے حیوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بیش قیمت انعام ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن کی ابتداء میں جہاں اپنے احسانات کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ بھی ہے عَلَّمَهُ الْبَيَانَ یعنی رحمٰن وہ ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اُسے بولنا سکھایا۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ جو اپنے والد ماجد امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فلسفے کے ماہر شمار ہوتے ہیں، وہ انسان کی تعریف یہ کرتے ہیں اَلَّذِیْ یَتَفَكَّرُ وَ یَصْنَعُ بِالْاٰلَاتِ یعنی وہ ہستی جو غور و فکر کرتی ہے اور آلات کو استعمال کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غور و فکر کا مادہ بھی انسان کے لیے بہت بڑا انعام خداوندی ہے۔ اسی غور و فکر کے نتیجہ میں انسان بڑے بڑے کام انجام دیتا ہے۔ اپنے ہاتھ کو استعمال کرتا ہے اور پھر بڑی بڑی مشینیں اور آلات ایجاد کر کے اِن سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کا جسم بذاتِ خود، اس کے ساتھ حاصل ہوتے والے قویٰ صحت اور اہل افراد سب اللہ تعالےٰ کے انعامات ہیں۔

کسبی انعام

بعض انعامات انسان خود اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ اِن میں تذکیہ نفس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اہل تصوف کی اصطلاح میں اِسے تخلیہ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر قسم کے رذائل سے پاک ہو جائے جب کوئی انسان عبادت

وریاضت میں پابندی اختیار کرتا ہے اور مشقت برداشت کرتا ہے تو اس کے جسم سے تمام رذیل خصلتیں منجملہ کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی، حسد، کینہ اور تکبر وغیرہ نکل جاتی ہیں۔ اور انسان بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے۔ یہی تخلیہ ہے کہ انسان سے تمام بری چیزیں نکل جائیں اور وہ اِن سے خالی ہو جائے، تخلیہ کا دوسرا معنیٰ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے ظاہر و باطن کو اخلاقِ حسنہ سے مزین کر لے۔ اِن میں ایمان، توحید اور دیگر تمام اچھے اخلاق شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت، مغفرت اور رضا بھی بہت بڑے انعامات ہیں جو کسی کو حاصل ہو جائیں۔ یہ چیز بھی محنت اور کسب سے حاصل ہوتی ہے اور انسان بالآخر علیین اور خطیرۃ القدس کا ممبر بن جاتا ہے

تکبر کی قباحت

کسی انسان کا جن رذائل سے پاک ہونا ضروری ہے ان میں ایک رذیل خصلت تکبر بھی ہے۔ انسانی وجود سے تکبر کا نکلنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے بزرگانِ دین بڑی محنت کراتے ہیں اور یہ کہیں آخر میں جا کر خارج ہوتا ہے۔ بعض بزرگان کا مقولہ ہے نَقْلُ الْجِبَالِ اَيْسَرُ مِنْ اِخْرَاجِ الْكِبْرِ مِنَ الْقُلُوْبِ یعنی کسی پہاڑ کو سوئی کے کنارے کے ساتھ اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ دلوں سے تکبر کو خارج کیا جائے ابلیس میں یہی بیماری تھی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے ملعون ٹھہرا۔ سورۃ بقرہ میں موجود ہے۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ابلیس نے تکبر کیا، اور کافروں میں ہو گیا۔ اسی طرح حسد بھی بہت بری خصلت ہے بزرگوں کا مقولہ ہے ما خلا جسد من حسد یعنی کوئی جسم حسد سے خالی نہیں۔ اس قبیح خصلت سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کے کسبی انعامات میں سے ہے کہ انسان تمام رذائل سے پاک ہو جائے۔

انعام یافتہ گروہ

تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ دُعا سکھلائی ہے کہ مولا کریم! ہمیں سیدھے راستے پر چلا جو اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے انعام فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں[1] کہ انعام یافتہ گروہ چار ہیں جن کا ذکر سورۃ نساء میں موجود ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالحین۔ انسان اِن چاروں گروہوں کے راستے پر چلنے کی درخواست کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ! ہمیں ایسی سوسائٹی عطا فرما جس کے ارکان ان چار مراتب والے لوگ ہوں اب ظاہر ہے کہ اِن گروہوں میں وہی لوگ شامل ہوں گے جنہوں نے قرآنِ کریم کا اتباع کیا، اس پر ایمان لائے، اس کو سیکھا اور اس پر عمل کیا اور اسی چیز کا نام قانون کی پابندی ہے۔ اس پابندی کے بغیر کوئی انسان ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ قانون کی پاسداری کے متعلق قرآن پاک میں جگہ جگہ ہدایات دی گئی ہیں جیسے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ (المائدہ) اے ایمان والو! جن چیزوں کو تمہارے لیے اللہ نے حلال کیا ہے۔ ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، سود، چوری، زنا، ڈاکہ قتل ناحق وغیرہ سب حرام امور ہیں، اِن کو اختیار نہ کرو، قانون شکنی شیطان کا کام ہے۔ لہٰذا تم قانون کی پابندی کرو کہ اسی میں تمہاری ترقی ہے اور یہی تمہارے لیے باعث نجات ہے۔

قانون کی پابندی کے سلسلے میں خلفائے راشدین کا نمونہ ہمارے پاس موجود ہے خاص طور پر حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کا دور تمام امت کے لیے متفق علیہ دستور کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعد میں امت کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔ تاہم اِن حضرات کے نمونہ پر عمل کر کے انسان منعم علیہم کا مصداق بن سکتے ہیں۔ اِن کے عملی نمونے

---

[1] تفسیر طبری صـ۷۶ جـ۲، تفسیر ابن کثیر صـ۲۸

زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں۔ معاملہ صلح کا ہو یا جنگ کا۔ عبادت کا مسئلہ ہو یا معیشت معاشرت اور تجارت کا، ہر جگہ ان کا نمونہ موجود ہے کہ انہوں نے ایسے مواقع پر کس طرح عمل کیا۔ معاملات زندگی کی بہت تھوڑی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن کے متعلق ان حضرات کے ادوار سے براہ راست راہنمائی حاصل نہیں ہوتی، تاہم اصول وضوابط ہر شعبے میں موجود ہیں جن کی روشنی میں آگے آنے والے مسائل کا حل بھی تلاش کیا جا سکتا ہے لہٰذا خلفائے راشدین کا دور بھی ہمارے لیے بہترین نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ انعام یافتہ گروہ کے لوگ ہیں۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک [1] ہے کہ جو شخص کسی جانی ہوئی چیز پر عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ان جانی چیز بھی سکھلا دیتا ہے اور جو شخص جانی ہوئی چیز پر عمل پیرا نہیں ہوتا تو اس کو راستہ کہاں مل سکتا ہے؟ آج مسلمانوں کی یہی حالت ہے۔ جو قوم آج اپنے اصول وضوابط اور نمونے کو چھوڑ کر دوسروں کے محتاج ہیں، محض فلسفہ چھانٹتے ہیں، عمل کا فقدان ہے، وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آج مسلمانوں کی کوئی چیز اپنی نہیں سیاست معیشت، معاشرت، تجارت ہر کام میں امریکہ اور یورپ سے ہدایات حاصل کرنے والے اور ان کے نمونے پر چلنے والے انعام یافتہ گروہوں میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اس سورۃ مبارکہ میں یہ دعا سکھلائی گئی ہے کہ اے پروردگار! ایسے لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعامات نازل فرمائے۔ ہمیں ایسے لوگوں کے ساتھ چلنے کی توفیق عطا فرما۔

اب آگے ان چار گروہوں کی مختصر تشریح عرض کی جائیگی۔

---

[1]

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵

ترجمہ:۔ راستہ اُن لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ۵

ربط آیات

پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان ہوئی، پھر اس کی صفات بیان ہوئیں۔ اس کے بعد عبادت و استعانت کو اُس کے ساتھ خاص کیا گیا اور پھر بندے کی طرف سے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں صراط مستقیم کی درخواست کی گئی۔ صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس کے انعام یافتہ لوگوں کا نمونہ بھی طلب کیا گیا۔ قرآنِ پاک میں موجود ہے کہ تمام انبیا اپنی اپنی امتوں کے لیے اولین نمونہ ہوتے ہیں جن کے راستے پر چل کر امت منزل مقصود تک پہنچتی ہے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص طور پر اسوہ حسنہ اور بلیغ کا ذکر قرآن پاک میں ہوا ہے۔ آپ بہترین نمونہ اور واضح نشانی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں آتا ہے[1] کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کے اخلاق حسنہ کے متعلق فرمایا كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ یعنی آپکا اخلاقِ مبارک یہی قرآن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی تعلیمات کا عملی نمونہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ پہلے انبیاء کے نمونے یہود و نصاریٰ نے بگاڑ دیے اور اب دنیا میں صرف ایک ہی نمونہ موجود ہے جو نبی آخر الزماں علیہ السلام کا ہے اسی لیے یہ درخواست کی گئی کہ مولا کریم! ہمیں اپنے انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

نمونہ کی اہمیت

کسی کام میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے نمونہ کی ضرورت و اہمیت کے

---

[1] مسلم ص ۲۵۶ ج ۱

متعلق امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں یہ بات نقل کی ہے مَن لَّا یَرٰی مُفْلِحاً لَّا یُفْلِحُ یعنی جو شخص کسی کامیاب آدمی کو نہیں دیکھتا، وہ خود بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظ میں بھی یہ بات موجود ہے اور بعض دوسرے بزرگوں نے بھی ایسا ہی لکھا ہے کہ نمونے کا مطلب یہی ہے۔ دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ کوئی ہنر کسی صاحب ہنر کو دیکھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا کامل درجے کا انجنیئر وہی ہوگا جس کے سامنے اعلیٰ درجے کے انجنیئر کا نمونہ موجود ہوگا۔ اچھے ڈاکٹر کی مثال بھی یہی ہے۔ کوئی سیاستدان بھی اُس وقت تک انقلابی سیاستدان نہیں بن سکتا جب تک وہ کسی انقلابی سیاستدان کے کارہائے کو پیش نظر نہیں رکھے گا۔ اسی لیے دعا میں درخواست کی گئی ہے کہ رب العلمین! ہمیں اُن لوگوں کا راستہ دکھا جن پہ تو نے انعام فرمایا۔ اور یہ چار گروہ ہیں جن کی تصریح قرآنِ پاک نے سورۃ نساء میں کر دی ہے اور یہ ہیں انبیاء، صدیق، شہدا اور صالحین۔

۱۔ انبیاء منعم علیہ گروہوں میں پہلا گروہ انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ انبیائے کرام پوری نسل انسانی اور خاص طور پہ اپنی اپنی امت کے لیے معیار ہوتے ہیں۔ اسی لیے اُن کا اتباع کرنا فرض ہے۔ ہر نبی نے اپنی امت کو یہی درس دیا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء) اے لوگو! اللہ سے ڈر جاؤ، کفر و شرک سے باز آجاؤ اور میری اطاعت کرو، اپنی زندگی کے لیے مجھے نمونہ پکڑو۔ اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے بھی یہ کہلوایا، کہ اے میری امت کے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بننا چاہتے ہو فَاتَّبِعُوْنِیْ میرا اتباع کرو يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران) اور تمہارے گناہ بھی معاف فرمائے گا۔ مطلب یہ کہ کمال حاصل کرنے کے لیے نبی کا نمونہ یعنی اُس کا اتباع اختیار کرنا ضروری ہے۔

ہر نبی انسان ہوتا ہے، چنانچہ علم عقائد والے نبی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ھُوَ اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ لِتَبْلِیْغِ مَا اَوْحَی اللّٰہُ اِلَیْہِ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالےٰ اُس کی طرف وحی کی گئی چیز کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ رسُول تو فرشتے بھی ہوتے ہیں، مگر نبی صرف انسان ہی ہوتے ہیں۔

انبیاء کا علمی اور عملی ورثہ

نبی کی ذات میں علمی اور عملی دونوں قسم کے کمالات ہوتے ہیں اور انہیں منبع علوم تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اصطلاح میں منبع علوم حظیرۃ القدس ہے جہاں سے انسانوں کی طبعی، عقلی یا مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے علم مہیا کیا جاتا ہے۔ انبیاء کا تعلق تجلی اعظم کے ساتھ کمال درجے کا ہوتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں اور آپ عقلمند ترین انسان تھے ڈارون کا نظریہ تو جہالت کی پیداوار ہے کہ ابتدا میں سب بندر تھے، پھر یہ ترقی کر کے انسانیت کی مد میں داخل ہو گئے۔ یہ بالکل باطل نظریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، انہیں نبوت عطا کی اور انہیں مکمل علم، عمل اور عقل عطا کی۔ انسان کی تمدنی ترقی کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ بتدریج ہوتی ہے آج سے سو سال پہلے کے لوگ آج کی سائنسی ترقی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سائنس نے انسان کے لیے نہایت تیز رفتار سواریاں مہیا کر دی ہیں اور انسانی ضروریات کی لاتعداد چیزیں مہیا کر دی ہیں مگر یہ تو تجربے کی چیزیں ہیں۔ جہاں تک عقلی، نظری اور عملی قوت کا تعلق ہے اس کا کمال انبیاء کو ہی حاصل ہوتا ہے

انبیاء کی معصومیت

انبیاء علیہم السلام کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ اُن سے گناہ سرزد نہیں ہوتا اگر نبی سے معمولی سی غلطی بھی ہو جائے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی جاتی ہے۔ اس قسم کی معمولی کوتاہی کو لغزش کہا جاتا ہے جہاں تک گناہ کا تعلق ہے وہ نبی کی ذات سے نہ

نبوت سے پہلے ہوتا ہے اور نہ نبوت کے بعد۔ نبی کو معمولی لغزش پر ہی تنبیہ ہو جاتی ہے اور اُسے اُس پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا۔ عام انسانوں اور انبیاء میں یہی فرق ہے۔ بڑے سے بڑا مجتہد بھی غلطی سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ ساری عمر خطا پہ قائم رہ سکتا ہے کیونکہ اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گارنٹی حاصل نہیں ہوتی۔ مجتہد کو اپنے درجے کے مطابق اللہ تعالےٰ سے اَجر و ثواب ضرور حاصل ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُسے غلطی سے ہٹائے۔ بہرحال انبیاء گناہوں سے پاک ہوتے ہیں مگر انسان ہوتے ہیں۔ البتہ اُن میں علمی عملی اور عقلی قوتیں کمال درجے کی ہوتی ہیں۔

۲۔ صدیق

منعم علیہ گروہوں میں سے دوسرا گروہ صدیقین کا ہے۔ صدیق راست باز کو کہتے ہیں۔ اور یہ وہ شخصیت ہوتی ہے جس کی قوت علمی اور نظری نبی کے قریب قریب ہوتی ہے یوں سمجھ لیں کہ صدیق کا ظرف ایسا صاف آئینہ ہوتا ہے جس پہ نبی کے علوم کا عکس پڑتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ حضور علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بالکل ویسی ہی بات کرتے تھے جیسی حضور علیہ السلام کی زبان سے نکلتی تھی۔ معاہدہ حدیبیہ کے موقع پہ حضرت عمر فاروقؓ بڑے پریشان ہوئے اور آپ سے عرض کیا، حضور! کیا آپ اتنی کمزور شرائط پہ صلح کر رہے ہیں؟ کیا ہم حق پہ اور کفار باطل پر نہیں ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا[1]، بالکل ایسا ہی ہے مگر اے عمرؓ! جان لو کہ میں اللہ کا نبی ہوں وَلَنْ يُّضَيِّعَنِيَ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اِسی میں مصلحت ہے۔ اس کے بعد اس بات کا ذکر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس کیا اور کہا کہ مسلمانوں کو اتنی کمزور شرائط پہ صلح نہیں کرنی چاہیئے، اس پر حضرت صدیقؓ نے فوراً کہا[2] اے عمرؓ! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے نبی ہیں وَلَنْ يُّضَيِّعَهُ اللّٰهُ

---

[1] بخاری ص ۱۷ ج ۲ [2] بخاری ص ۱۷ ج ۲

اور اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا مطلب یہی تھا کہ جو کچھ حضور علیہ السلام کر رہے ہیں مسلمانوں کی اسی میں بہتری ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت صدیق رضی کی زبان سے بھی بالکل وہی الفاظ نکلے جو خود حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے تھے تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صدیق کا ذہن اور دماغ اتنا شفاف آئینہ ہوتا ہے جس پر نبی کے علم کا عکس پڑتا ہے اور اس کی بات نبی کی بات سے مل جاتی ہے ایسے شخص کو صدیق کا لقب دیا گیا ہے۔

۳۔ شہداء

تیسرا انعام یافتہ گروہ شہداء کا ہے۔ شہدا کی قوت عملیہ کو کمال حاصل ہوتا ہے جس طرح نبی کی قوت عملی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے، اسی طرح شہید کی قوت عملی اُس کے قریب قریب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہید اپنے دین اور خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی جان پر بھی کھیل جاتے ہیں اور اس طرح وہ حق و صداقت کی گواہی دینے والے بن جاتے ہیں۔ جان کا نذرانہ پیش کرنے والا اسی شہادت کی بناء پر شہید کہلاتا ہے۔

۴۔ صالحین

انعام یافتہ گروہوں میں چوتھا گروہ صالحین کا ہے۔ اُن کی قوت علمی اور عملی اگرچہ اعلیٰ ترین درجے کی تو نہیں ہوتی مگر اِن میں کامل درجے کا اتباع پایا جاتا ہے۔ ایسے لوگ انبیاء کے خاص متبعین ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو فاسد اعتقادات اور بُرے اخلاق سے دُور رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ صالح اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرتا ہے اور مخلوق کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتا ہے۔ عام اصطلاح میں ایسے لوگوں کو ولی کہا جاتا ہے یہی صالحین ہیں اور باقی لوگ اُن سے کم درجے میں ہوتے ہیں۔

غرضیکہ صراط مستقیم کے حصول کے لیے اِن چار اقسام کے لوگوں کا نمونہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ مولا کریم! ایسے راستے پر چلا جس راستہ کو تیرے اِن انعام یافتہ لوگوں نے

اختیار کیا۔

غلط نسبت مفید نہیں

اب دوسری بات بھی ملاحظہ فرمائیں۔ عام انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ذہن، دماغ، قوتِ علمیہ، قوتِ عملیہ اور قوتِ نظریہ کو منعم علیہ لوگوں کے نمونے پر استعمال کریں۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوجائیں تو اِن کی نسبت اِن چار گروہوں کے ساتھ درست ہوجائیگی۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو منعم علیہ گروہوں کے مطابق نہ ڈھال سکیں تو پھر اُن کے ساتھ خالی خولی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے گی۔ قرآنِ پاک میں یہ بات واضح طور پر سمجھادی گئی ہے کہ جو لوگ اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں یعنی یہود و نصاریٰ، جب تک وہ اپنا عقیدہ اور عمل اُن کے مطابق نہیں بنائیں گے، محض اُن کی طرف نسبت کچھ کام نہ آئے گی۔

شیعہ حضرات اپنی نسبت اہل بیت کی طرف کرتے ہیں گویا یہ لوگ اہل بیت کے محب ہیں حالانکہ اگر عقیدہ اور عمل کی کسوٹی پر جانچا جائے تو اِن لوگوں کی حضور کے خاندان کے ساتھ کوئی نسبت نظر نہیں آتی۔ حضور علیہ السلام کے خاندان مرد و خواتین تو امت کے لیے پیشوا اور بزرگ تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کامل نمونہ تھے، مگر شیعوں کا عقیدہ اور عمل اُن حضرات کے بالکل خلاف ہے، بھلا اِن کی نسبت کیسے درست ہوسکتی ہے؟ ان کا دعوئے محبت جھوٹ محض ہے۔ لہٰذا محض بزرگوں کی طرف نسبت کر دینا قطعاً مفید نہیں ہوگا۔

صوفیاء کرام کی طرف نسبت

اِس زمانے میں عام لوگ چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی، جیلانی وغیرہ کہلاتے ہیں اور اپنی نسبت اِن صالحین کی طرف کرتے ہیں حالانکہ اِن کے درمیان کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی بلکہ اکثر کے عقائد و اعمال اُن بزرگوں کے خلاف ہیں بمثال کے طور پر چشتیہ سلسلے کو لے لیں چشت ایک مقام کا نام ہے۔ حضرات خواجہ معین الدین

اجمیریؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور اُن کے پیر و مرشد سلسلہ چشتیہ کے بزرگ تھے، اُن میں علم، عمل، تقویٰ اور پرہیزگاری کمال درجے کی تھی۔ اِن کے مریدوں میں سے بعض حضرات چین تک پہنچے، تبلیغِ دین کی جس کے نتیجے میں بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا مگر اب ان بزرگوں کا نام لیوا رہ گئے ہیں۔ ان میں نہ وہ علم ہے اور نہ عمل، نہ وہ تقویٰ ہے اور نہ وہ پرہیزگاری۔ اب چشتیہ طریقے کا کام گانے بجانے، قوالی کرانے، قبر پرستی، اور ترکِ سنت تک محدود ہو کر رہ گیا، بھلا اس قسم کی نسبت کسی کو کیا فائدہ دے سکتی ہے؟ قادری طریقے والوں کا کام بھی اب یہی رہ گیا ہے کہ قبروں پر چادریں اور چڑھاوے چڑھائیں۔ عُرس منائیں یا ختم پڑھ کر قادری بن جائیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تو کمال درجے کے بزرگ تھے آپ کے مواعظ، اخلاقِ حسنہ، دین کے لیے لگن اور آپ کا عقیدہ و عمل تو خود آپ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ مگر آپ کی تحریروں کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ آپ زندگی بھر کیا کرتے رہے اور اپنے مریدوں کو کس بات کا حکم دیتے رہے۔ اس زمانے میں ان بزرگوں کے نام پر بدعات کو رواج دیا جا رہا ہے۔ بھلا ایسی غلط نسبت کسی کے کہاں کام آئے گی؟ اِس طرح قادری، سہروردی اور نقشبندی جیسی نسبتیں کسی کام نہیں آسکتیں جب تک اپنے عقیدہ اور عمل کو ان بزرگوں کے مطابق نہ بنایا جائے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ابویزید بسطامیؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، حضرت علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بختیار کاکیؒ، عثمان ہارونیؒ، خواجہ فرید الدینؒ اور خواجہ بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ، بڑی بزرگ ہستیاں تھیں جنہوں نے اپنے عمل کے ذریعے کفرستان میں دین کی شمع روشن کی مگر آج صرف اُن کے نام لینے والے باقی ہیں جو اُن کی گدیوں کی آمدنی پر پل رہے ہیں، ورنہ اِن لوگوں کی اُن بزرگوں کے ساتھ کوئی نسبت نظر نہیں آتی۔ اور جو لوگ زبردستی اپنے آپ کو اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں

ہو گا جب تک عقیدہ اور عمل ان بزرگوں کے مطابق نہ ہو۔

اصحاب مذاہب کی نسبت

اِسی طرح مختلف مذاہب والوں کا بھی یہی حال ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، مقلد، غیر مقلد، اہلِ حدیث کہلانے والے بھی خالی نسبت پہ انحصار کرکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس شخص نے امام ابُو حنیفہؒ کا طریقہ نہیں پکڑا وہ حنفی کہلانے کا ہرگز حقدار نہیں۔ جب تک اُن جیسا عقیدہ اور عمل نہیں ہوتا اُس وقت تک محض حنفی کہلا لینا کچھ مفید نہیں ہو گا، اسی طرح شافعی، مالکی اور حنبلی نسبت ہے۔ اِن مذاہب کو ماننے والے جب تک اِن مذاہب کے اُصول وضوابط کو نہیں اپناتے محض اپنی نسبت اُن کی طرف کر لینے سے کیا حاصل ہو گا؟ اہل حدیث کہلانے والوں کو بھی اپنی نسبت امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ کے ساتھ ثابت کرنا ہو گی، ورنہ اُن کے دعوے میں بھی کوئی صداقت نہیں۔ غرضیکہ کوئی کسی بھی مسلک، عقیدے، یا سلسلے سے تعلق رکھتا ہو، اُس کا دار ومدار اس کے عقیدے اور عمل کی اصلاح پر ہے، محض کوئی نام رکھ لینا کسی کام نہیں آسکتا۔

یہود ونصاریٰ کی نسبت

یہودیوں نے اپنی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف کر رکھی ہے حالانکہ یہ اپنے عقیدے اور عمل کے لحاظ سے اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں یہودیوں کا کوئی عمل موسیٰ علیہ السلام سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ہی عیسائیوں کا کوئی فعل عیسیٰ علیہ السلام کی سنت کے مطابق ہے۔ محض یوم ولادت منا لینا، گانا بجانا ڈھول ڈھمکا، شراب نوشی اور شور وشر کو عیسیٰ علیہ السلام کے کردار سے کیا نسبت ہے؟ اب پوری عیسائی دُنیا کا عمل کرسمس ڈے منانے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے مگر دعویٰ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے سچے پیروکار ہیں۔ بھائی! ایسی خالی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام نعوذ باللہ عیاشی اور فحاشی کا درس دیتے تھے وہ تو اللہ تعالیٰ کی توحید کے مبلغ تھے، بُرائی سے منع کرتے تھے۔ یہودی عالم جو علم کا دعوےٰ کرتے اور غلط باتیں

کرتے تھے۔ اُن کو علیٰ علیہ السلام کہتے تھے، سانپ کے بچو! تم جھوٹے فقیہ بنے پھرتے ہو، خود گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہو، تم خالص دُنیا دار اور لعنتی ہو۔ بہرحال یہ جھوٹی نسبت قطعاً مفید نہیں ہو سکتی، نسبت صحیح ہو گی تو کچھ فائدہ ہو گا، ورنہ نہیں

خواجہ ابراہیم ادھمؒ

خواجہ ابراہیم ادھمؒ بادشاہ تھے مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ اللہ کرنے لگے بزرگوں سے ملے، عبادت و ریاضت کی، حج کیا اور آخر میں ملک سے بہت دور صوبہ شام کے علاقہ صوریہ میں وفات پائی۔ اُن کے متعلق امام رازیؒ تفسیر کبیر میں[۱] رقمطراز ہیں کہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل جا رہے تھے۔ راستے میں کسی دیہاتی نے پوچھا، شیخ! کہاں کا ارادہ ہے؟ فرمایا بیت اللہ شریف کی زیارت کا ارادہ ہے اعرابی کہنے لگا، اتنا لمبا سفر ہے اور آپ کے پاس سواری بھی نہیں ہے۔ خالی ہاتھ ہیں آپکے پاس توشہ بھی نظر نہیں آتا۔ ابراہیم ادھمؒ نے جواب دیا، بھائی! میرے پاس تو بہت سی سواریاں ہیں مگر تمہیں نظر نہیں آتیں، جب مجھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو صبر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں، جب کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر کی سواری کو استعمال کرتا ہوں، جب خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی فیصلہ آجاتا ہے، قضا نازل ہوتی ہے تو میں رضا کی سواری پہ سوار ہو جاتا ہوں اور جب نفس کسی بات پہ آمادہ کرتا ہے تو میں یقین سے جان لیتا ہوں اور نفس کو کہتا ہوں کہ زندگی کے زیادہ دن گذر گئے ہیں اور تھوڑے دن باقی ہیں۔ تو مجھے کس راستے پہ ڈالنا چاہتا ہے۔ لہٰذا نفس رُک جاتا ہے کیونکہ کیا معلوم ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہی موت آجائے۔ جب دیہاتی نے یہ بات سُنی تو کہنے لگا سِر بِاِذْنِ اللّٰہِ فَاَنْتَ رَاکِبٌ وَاَنَا رَاجِلٌ چلیئے صاحب! آپ اپنا سفر جاری رکھیں۔ خدا کے حکم سے آپ سوار ہیں اور مَیں پیدل ہوں۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ

اس دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں۔ جنہوں نے بادشاہی میں بھی فقیری

---

[۱] تفسیر کبیر جلد ۱۹ صفحہ ۲۵۶

کی، ایسی ہی ایک شخصیت برصغیر میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تھی۔ کابل سے لے کر برما تک کا علاقہ زیرِ نگین تھا مگر شاہی بیت المال سے کبھی ایک پیسہ تک وصول نہ کیا اپنے ہاتھ کی کمائی پر گزر اوقات تھی۔ قرآن کریم کی نہایت خوش خط کتابت کرتے تھے۔ نیز اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں بناتے تھے۔ اِن دو ذرائع کی آمدنی سے گھر کے اخراجات چلتے تھے۔ آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید آج بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔ آپ کمال درجے کے متقی پرہیز گار اور خوفِ خدا رکھنے والے تھے یہ مقولہ آپ ہی پر صادق آتا ہے۔ "آنکہ در شاہی فقیری کردند" یعنی وقت کے بادشاہ ہوتے ہوئے بھی پوری زندگی فقیری کی حالت میں بسر کر دی۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے غلط پراپیگنڈا کیا ہے کہ اورنگ زیب نے بھائی کو ناحق مروا دیا اور باپ کو قید کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے بھائی نے ایک مسکین آدمی کو ناحق قتل کر دیا تھا جس کے بدلے میں آپ نے بھائی کو سزائے موت دی۔ باپ قاتل کی ناجائز طرفداری کرتا تھا، لہٰذا اُسے بھی راستے سے ہٹانے کے لیے قید کر دیا۔ بہر حال آپ انسان تھے اور کوئی انسان غلطی سے خالی نہیں مگر آپ کے تقویٰ اور زہد کی کوئی مثال نہیں ملتی آپ کے جانشین سب نالائق ثابت ہوئے جن کے غلط کارناموں کی وجہ سے سلطنت میں دراڑیں پڑ گئیں۔

بہر حال یہ تھے وہ بزرگ جنہوں نے دنیا میں مثالیں قائم کیں، اُن کا عقیدہ عمل اور اخلاق نہایت اعلیٰ درجے کا تھا اور یہ لوگ صحیح معنوں میں عالم باعمل تھے۔ مگر آج ہماری خالی نسبت کچھ کام نہیں آسکتی۔ ہم محض بزرگانِ دین کی طرف نسبت کر کے ہی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں حالانکہ اصل چیز عقیدہ اور عمل ہے۔ جب تک یہ چیزیں درست نہیں ہوں گی، کوئی نسبت مفید نہیں ہوگی۔ تو صراطِ مستقیم کی دُعا میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مولا کریم! ہمیں اپنے انعام یافتہ بندوں کے راستے پر چلا جن کی بعض مثالیں میں نے عرض کر دی ہیں۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ ع

ترجمہ :- نہ وہ لوگ جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہ ۝

ربط آیات

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد اُس کی صفات کا ذکر ہوا اور اس کے بعد عبادت واستعانت کا ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونے کا بیان تھا۔ پھر بندوں کی طرف سے درخواست کی گئی کہ مولا کریم! ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ انسانوں کی اولین ضرورت یہ ہے کہ اُن کے سامنے صراطِ مستقیم واضح ہو جائے۔ اس کے بعد صراطِ مستقیم کے لیے نمونے کا ذکر کیا گیا کہ یا اللہ! ہمیں اُن لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا۔ قرآنِ پاک نے انعام یافتہ چاروں گروہوں یعنی انبیا، صدیق، شہید اور صالحین کی وضاحت فرما دی کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے نمونے پر چلنے کی ضرورت ہے اور جن کا طریقہ اختیار کیے بغیر کوئی انسان فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔

مغضوب علیہ اور ضال

اب آج کی آیت کریمہ میں غلط کار لوگوں کے راستے سے بچ رہنے کی درخواست کی گئی ہے۔ گذشتہ آیت میں عرض کیا گیا تھا کہ اے اللہ! ہمیں اُن لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تیرا انعام ہوا اور اب یہ کہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ اُن لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ جو گمراہ ہوئے۔ مغضوب علیہ وہ شخص یا گروہ ہوتا ہے جو جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے۔ ایسے لوگ حقیقت سے واقف ہوتے ہیں، حق کو پہچانتے ہیں اور دیدہ دانستہ اُسے چھپا جاتے ہیں۔ ایسے لوگ عمل کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں، جو علم ہوتے کے باوجود حق پوشی کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف گمراہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو علم کی دولت سے محروم ہیں۔ انہیں صحیح راستے کی پہچان ہی نہیں ہوتی، اس لیے یہ اصل

راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں انہیں ضال کہا گیا ہے تاہم مغضوب علیہ اور ضال دونوں گروہ مردود ہیں اور ان کے مقابلے میں انعام یافتہ گروہ مقبول ہیں۔ حدیث شریف[1] میں یہودیوں کو مغضوب علیہ اور عیسائیوں کو ضال کہا گیا ہے۔

حاتم طائی کی بہن

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے[2] کہ صحابہ کا ایک گروہ جہاد کے لیے بنی طے کے علاقہ میں گیا۔ عربوں کا یہ مشہور قبیلہ اگرچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا مگر انہوں نے عیسائیت اختیار کر رکھی تھی۔ حاتم طائی اس قبیلے کا مشہور آدمی گزرا ہے جس کی سخاوت کے قصے دُور دُور تک مشہور تھے۔ امام ابن قتیبہ نے اپنی کتاب الشعر والشعراء میں لکھا ہے کہ حاتم طائی نے انیس ۱۹ مرتبہ اپنی ساری کی ساری دولت لٹا دی۔ اس قبیلہ کے لوگ بھی مسلمانوں کے خلاف تھے، لہٰذا اِن کے ساتھ جھڑپیں ہوئیں موقع پا کر مسلمانوں نے اس علاقے پر حملہ کر دیا۔ دشمن مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ گیا اور کچھ لوگ قیدی بنا لیے گئے جن میں[3] حاتم طائی کی بہن بھی تھی۔ البتہ حاتم طائی کا بیٹا عدی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا

جب جنگی قیدیوں کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا تو حاتم طائی کی بہن نے درخواست کی کہ حضور[4]! میں بوڑھی عورت ہوں کوئی خدمت بھی انجام نہیں دے سکتی، میرا نمائندہ اور بھتیجا عدی بھی بھاگ گیا ہے، آپ مہربانی فرما کر مجھے آزاد کر دیں۔ حضور علیہ السلام نے بڑھیا کی درخواست قبول کرتے ہوئے اُس کی رہائی کا حکم دیا۔ پاس ہی حضرت علیؓ بھی کھڑے تھے، آپ نے اُس عورت سے کہا کہ حضور سے سواری کی درخواست کرلو، واپس کیسے پہنچو گی۔ چنانچہ اُس نے پھر عرض کیا۔ حضور۔ میں بوڑھی عورت ہوں، سفر دراز ہے اور ساتھی بھی کوئی نہیں، مہربانی فرما کر کوئی سواری بھی عنایت کر دیں۔ حضور علیہ السلام نے بڑھیا کی یہ درخواست بھی منظور فرمائی اور اس کے لیے سواری کا بندوبست

---

[1] ترمذی ص ۱۲۴ ج ۲، [2] مسند احمد ص ۳۷۸ ج ۴، [3] ابن کثیر ص ۲۹ ج ۱۲ طبع مصر بحوالہ مسند احمد والاحادیث الطوال للطبرانی طبع بیروت ص ۱۴، ۱۵، [4] مسند احمد ص ۳۷۸ ج ۴

بھی کر دیا۔ جب وہ عورت اپنے علاقے میں واپس پہنچی تو اس نے اپنے بھتیجے عدی سے کہا کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ تیرا باپ بھی ہوتا تو ایسا نہ کرتا، اس شخص نے میری عزت کی، رہا کیا اور پھر سواری بھی مہیا کی۔

عدی طائی کا قبول اسلام

کچھ عرصہ بعد عدیؓ بن حاتم طائی بھی حضور کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس نے گلے میں صلیب لٹکا رکھی تھی۔ حضور نے دیکھا تو فرمایا اَلْقِ عَنْکَ ھٰذَ الْوَثَنَ اس بت کو اتار پھینکو، یہ تو شرک کی نشانی ہے۔ عیسائی صلیب کا نشان اس لیے اپنے گلے میں پہنتے ہیں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا دیا گیا حالانکہ قرآن پاک کا فرمان ہے کہ نہ تو مسیح علیہ السلام کو قتل کیا گیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا گیا اور نہ ہی ان کی موت واقع ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا۔ صحیح احادیث میں یہ بھی موجود ہے کہ قربِ قیامت میں عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے۔

بہرحال حضور علیہ السلام نے عدی سے فرمایا کہ تم کیوں بھاگتے ہو، اللہ کی وحدانیت سے گریز کرتے ہوئے، کیا خدا تعالیٰ کے سوا بھی کوئی معبود ہے؟ آپ نے فرمایا، کیا تم اللہ اکبر کے کلمہ سے بھاگتے ہو؟ تمہیں اللہ کو سب سے بڑا ماننے میں کیا اعتراض ہے؟ یہ سن کر عدی کچھ دیر کے لیے خاموش رہا اور پھر عرض کیا، حضور! میں تو حنیف ہو گیا ہوں یعنی میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس پر حضور علیہ السلام خوش ہو گئے۔

یہودی اور عیسائی

اسی حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہودیوں کے متعلق فرمایا کہ یہ مغضوب علیہ ہیں۔ انہوں نے نافرمانی کی، خدا تعالیٰ کے قانون کو توڑا، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی۔ لہٰذا ان کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے۔ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ (البقرہ) یعنی اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا۔ یہ مغضوب علیہم ہیں۔

ترمذی ص ۱۴۰ ج ۲

اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف یہودی ہی مغضوب علیہ ہیں بلکہ جتنے بھی کافر مشرک، مجوسی صابی ستارہ پرست، ہندو، سکھ، جاپانی منکرینِ خدا اور کمیونسٹ وغیرہ سب مغضوب علیہ لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی راہ راست پر نہیں ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ بھٹک گئے ہیں انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں اس حد تک غلو کیا کہ انہیں الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا۔ چنانچہ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ یعنی خدا کا بیٹا کہہ دیا۔ انہوں نے ثالث ثلاثہ یعنی تین میں سے تیسرا اور باپ، بیٹا اور روح القدس جیسا باطل عقیدہ اختیار کیا۔ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی مدح سرائی کرتے کرتے ہی راہ راست سے بھٹک کر گمراہ ہو گئے اسی مبالغہ آمیزی کے رد میں خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان[1] بھی ہے لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ لوگو! میری تعریف میں مبالغہ نہ کرنا جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے متعلق اختیار کیا۔ فرمایا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ میں تو اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں، لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو۔

امام مجددؒ نے ایک نقطہ بیان فرمایا ہے کہ ہم تشہد میں پڑھتے ہیں اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہاں پر عبد کو پہلے اور رسول کو بعد میں اسلیے لایا گیا ہے کہ عبد کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے اور رسول کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے، لہٰذا اللہ کے ساتھ تعلق کی درستگی پہلے ہونی چاہیئے۔ اللہ کے رسول کو پہلے بندہ سمجھو کہ وہ بھی اپنے خالق و مالک کی بندگی کرنے والا ہے، وہ خود الٰہ نہیں ہے۔ اسی لیے عبدیت کا

---

[1] بخاری صفحہ ۴۹۰ جلد ۱

اقرار پہلے کرایا گیا ہے اور رسالت کا بعد میں۔

منعم علیہ اور مغضوب علیہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق میں سے انسان اور جنات مکلف ہیں اور یہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے، وہ منعم علیہ[1] ہے۔ اُس پہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل ہوتا ہے اور وہ انعام یافتہ ہوتا ہے۔ بصورت دیگر اگر کوئی شخص نافرمانی کرتا ہے اور معصیت میں مبتلا ہے تو وہ مغضوب علیہ ہے اُس پہ اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضگی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ (النساء) یہی لوگ ہیں جن پہ اللہ کی لعنت ہوئی۔ سورۃ مائدہ میں یہ بھی فرمایا مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ جس پہ اللہ کی لعنت اور غضب ہُوا۔ نافرمانی کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت، غضب اور ناراضگی آتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ جہالت کی وجہ سے راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں وہ ضال کہلاتے ہیں بہر حال مقبول گروہ ایک ہی ہے اور وہ منعم علیہ گروہ ہے۔ باقی سب گروہ مردود ہیں۔ عمل میں خرابی ہو تو انسان فاسق ہو کر مغضوب علیہ بن جاتا ہے اور اگر علم میں خرابی ہو، عقیدہ فاسد ہو جائے تو ایسا شخص ضال ہوتا ہے۔ یہ سب گروہ مغضوب علیہ یا ضال ہیں سوائے ان لوگوں کے جن کے علم اور عمل دونوں صحیح ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جو انبیاء، صدیق، شہداء اور صالحین کے نقش قدم پہ چلتے ہیں، یہی مقبول ہیں۔

شیطان کے داخلے کے تین راستے

مفسرین کرام[2] بیان فرماتے ہیں کہ شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لیے تین راستوں سے داخل ہوتا ہے اور اس کے قلب و ذہن میں گمراہی کی باتیں ڈالتا ہے۔ اگر شیطان شہوت کے راستے سے انسان کے اندر داخل ہو تو انسان اپنی ذات پہ ظلم کرتا ہے۔ فرمایا اپنی جانوں پہ ظلم نہ کرو۔ بعض اوقات انسان ایسے کام کرنے لگتا ہے جس سے خود

---

[1] تفسیر کبیر ص ۲۶۱/ج ۱ [2] تفسیر عزیزی ص ۵۶/ج ۱

اپنا ہی بُرا ہوتا ہے۔ پھر فرمایا اگر شیطان غضب کے راستے سے داخل ہوتا ہے تو انسان کو غصہ دلاتا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ کسی کے ساتھ زیادتی کی، مارکٹائی، گالی گلوچ اور حق تلفی کی یا کسی کا مال وجان تلف کیا۔ یہ سب دوسروں پر ظلم ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر شیطان خواہش کے راستے سے مداخلت کرتا ہے تو انسان خواہش اور ہوا کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے جیسے فرمایا اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ (الفرقان) کیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی معبود بنا لیا، ایسا آدمی اللہ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہوتا ہے، اس طرح وہ گویا خدا تعالیٰ پر زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے۔

بہرحال مَیں نے مغضوب علیہ اور ضال کے بارے میں عرض کر دیا کہ مغضوب علیہ وہ ہوتے ہیں جن کی قوتِ عملیہ خراب ہو، فاسق بھی اسی گروہ میں شامل ہیں اور ضال وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی فکر فاسد ہو جائے عقیدہ بگڑ جائے جو کہ علمی خرابی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ابلیس کا واویلا

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں[1] کہ ابلیس جس نے انسانوں کو گمراہ کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے، اُسے تین مواقع پر سخت تکلیف پہنچی اور اُس نے بڑا واویلا کیا۔ پہلا موقع تو وہ تھا جب اللہ نے فرمایا فَاخْرُجْ مِنْھَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ (الحجر) یہاں سے نکل جاؤ، تم ملعون و مردود ہو۔ جب شیطان نے تکبر کی بنا پر آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے مردود قرار دیکر اپنی بارگاہ سے نکال دیا اس کے بعد جب حضور علیہ السلام کی دُنیا میں بعثت ہوئی، تو اس وقت بھی شیطان نے بڑا واویلا کیا تھا کہ اب اِس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ پھر تیسری دفعہ شیطان نے اس وقت واویلا کیا، جب یہ سورۃ فاتحہ نازل ہوئی۔

---

[1] تفسیر عزیزی صفحہ ۵۹ ج ۱

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے، سورۃ فاتحہ بڑی فضیلت والی سورۃ ہے۔ یہ پورے قرآن پاک کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ درجے کے اعتبار سے یہ قرآن پاک کی سب سے بڑی سورۃ ہے[1]۔ جو اس پر ایمان لائے گا، اُس کی تلاوت کریگا۔ اُس کے سامنے شیطان مغلوب ہوگا۔ امام حسن بصریؒ کا مقولہ ہے[2] کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ کو پڑھ لیا اُس نے گویا، تورات، زبور، انجیل اور قرآن پاک چاروں کتابوں کو پڑھ لیا۔

---

[1] بخاری ج۲ ص۶۴۲ [2] تفسیر عزیزی ج۱ ص۵۹

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ترجمہ :- نہ وہ لوگ جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہ ۝

تین اہم مسائل

سورۃ فاتحہ کے الفاظ اور اُن کی تشریح عرض کی جاچکی ہے۔ اب اسی سورۃ سے تعلق رکھنے والے تین مزید مسائل ایسے ہیں، جن کا تذکرہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے ان میں سے ایک مسئلہ بعض فروعی اختلافات کا ہے۔ دوسرا مسئلہ آخری آیت میں آنے والے حرف "ض" کے مخرج کا ہے اور تیسرا اُس اعتراض کے متعلق ہے جو بعض غیر مسلم اس سورۃ مبارکہ کے کلامِ الٰہی ہونے پر کرتے ہیں۔

۱- فروعی اختلافات
۱- آمین

سورۃ فاتحہ کے اختتام پر آمین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اسکا مطلب ہے۔ اے پروردگار اِسْتَجِبْ یعنی اِس دُعا کو قبول فرما۔ چونکہ یہ لفظ قرآن پاک کا لفظ نہیں ہے، اس لیے لکھنے میں تو نہیں آتا، تاہم اس کا پڑھنا مستحب ہے اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے صحیح احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان[1] ہے کہ جب امام غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ جب امام آمین کہتا ہے تو تم بھی آمین کہو۔ تیسری روایت[2] میں اس طرح ہے کہ اس موقع پر اللہ کے فرشتے بھی آمین کہتے ہیں اور جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ موافق ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اُس کے سابقہ گناہ معاف کردے گا۔ فرشتوں کے ساتھ موافقت وقت کے لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی جس وقت فرشتے آمین کہیں اُسی وقت دوسرے نمازی بھی کہیں تو وہ اُجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔ اور اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے

---

[1] نسائی صفحہ ۱۴۷/۱ج [2] بخاری صفحہ ۱۰۸/۱ج، مسلم صفحہ ۱۷۶/۱ج

کہ جس خلوص کے ساتھ فرشتے آمین کہتے ہیں۔ اسی خلوص اور نیت کے ساتھ نمازی بھی آمین کہیں گے تو اُن کے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

البتہ اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آمین بلند آواز سے کہنی چاہیئے یا پست آواز سے۔ بعض آئمہ کرام اونچی آواز سے آمین کہنے کے حق میں ہیں جب کہ امام ابُوحنیفہؒ آہستہ آواز کے قائل ہیں۔ روایات دونوں قسم کی آئی ہیں اور یہ صرف ترجیح کا مسئلہ ہے کہ کس امام نے کس طریقہ کو ترجیح دی ہے۔ اس کو خواہ مخواہ جائز اور ناجائز کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ فروعی مسئلہ ہے۔ مسند احمدؒ[1] میں حضرت وائلؓ کی روایت میں صاف طور پر آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے آمین کہا لیکن اَخْفٰی بِهَا صَوْتَهٗ، مگر آہستہ آواز سے اسی طرح جہر سے کہنے کی بھی صحیح احادیث موجود ہیں مگر امام ابُوحنیفہؒ کے استاد الاستاد امام ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں[2] کہ میں آہستہ آواز والی روایت کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اکثر صحابہؓ اور تابعینؒ اسی کے قائل ہیں۔ بعض اوقات کسی چیز کو تعلیم کی غرض سے بلند آواز سے کہنا بھی روا ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ[3] بعض اوقات نماز میں سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ بھی بلند آواز سے پڑھتے تھے، ورنہ عام طور پر یہ آہستہ پڑھی جاتی ہے۔ اس طرح سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ بھی پست آواز سے، رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ بھی اور آمین بھی آہستہ آواز سے کہنی چاہیئے حدیث میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے بعض اوقات[4] ظہر کی نماز میں بھی بلند آواز سے قرأت کرتے تھے۔ حالانکہ اس نماز میں جہر نہیں ہے، بہرحال ایسا تعلیم کی غرض سے تو ہو سکتا ہے مگر عام دستور آہستہ ہی ہے۔ اور بعض نے آمین بلند آواز سے کہنے کو ترجیح دی ہے۔

---

[1] مسند احمد ص ۳۱۶ ج ۴ [2]

[3] مسلم ص ۱۷۲ ج ۱ [4] بخاری ص ۱۰۵ ج ۱، مسلم ص ۱۸۵ ج ۱

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی کتاب "غنیۃ الطالبین[1]" میں لکھا ہے کہ نماز کے کچھ فرائض ہیں، کچھ واجبات، کچھ سنن اور کچھ ہیئات فرماتے ہیں کہ اختلاف صرف ہیئات میں پایا جاتا ہے۔ کوئی امام ایک ہیئت اختیار کرتا ہے تو دوسرا امام دوسری۔ تاہم جو بھی ہیئت اختیار کی جائے اس پر عمل کرتے رہنا چاہیئے اور ایک دوسرے کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیئے کہ فلاں سنت کے خلاف کر رہا ہے یا فلاں کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سارے طریقوں کو جائز سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کو برداشت کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی شافعی یا حنبلی ہے تو بیشک بلند آواز سے کہے اور اگر کوئی حنفی ہے تو آہستہ آواز سے کہے، اس میں جھگڑنا نہیں چاہیئے۔

۲۔ رفع یدین

رکوع جاتے وقت اور رکوع سے اُٹھتے وقت رفع یدین کرنا بھی فروعی مسئلہ ہے اور ترجیح سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص نماز میں داخل ہوتا ہے تو دو فرائض اور ایک سنت ادا کرتا ہے۔ پہلا فرض نیت ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے نیت ضروری ہے کہ فلاں وقت کی نماز ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی عبادت دل کے ارادے اور نیت کے بغیر ادا نہیں ہوتی کیونکہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ[2] اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ پھر دوسرا فرض اللہ اکبر کہنا ہے۔ جب تک یہ الفاظ ادا نہیں کرے گا، نماز میں داخل نہیں ہوگا۔ تیسری چیز جو سنت ہے، وہ رفع یدین یعنی دونوں ہاتھوں کا اٹھانا ہے۔ نماز کی ابتدا میں تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرنا تو سب کے نزدیک سنت ہے[3]، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ البتہ رکوع جاتے وقت، رکوع سے کھڑے ہوتے وقت اور درمیانی تشہد کے بعد اٹھتے وقت رفع یدین کرنا بھی روایات میں آتا ہے مگر یہ متفق علیہ نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ان مواقع پر رفع یدین نہ کرنے کے حق میں ہیں[4]، وہ اسی کو بہتر سمجھتے ہیں۔

---

[1] [2] بخاری ص ۲ ج ۱ [3] ہدایہ ص ۹۴ ج ۱ [4] ہدایہ ص ۱۷ ج ۱

البتہ بعض دیگر آئمہ اِن مواقع پر بھی رفع یدین کرنے کے قائل ہیں۔ مسئلہ یہ بھی ترجیح کا ہے۔ کسی امام نے رفع یدین کرنے کو ترجیح دی ہے اور دوسرے نے نہ کرنے کو۔ جو رفع یدین کرتا ہے اس کا بُرا نہیں منانا چاہیئے اور جو نہیں کرتا اُسے کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ کوئی فرض تو نہیں ہے۔ اگر کوئی فرض قرار دیتا ہے تو یہ غلط بات ہے۔

۳۔ ہاتھ باندھنا

اللہ اکبر کہ کر ہاتھ کہاں باندھنے ہیں، اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کوئی ناف کے نیچے باندھتے ہیں، کوئی ناف کے اُوپر اور کوئی سینے پر۔ یہ بھی ترجیح کا مسئلہ ہے، روایات ہر قسم کی موجود ہیں کوئی امام ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں اور کوئی دوسرے کو اور کوئی تیسرے کو۔ امام اُبوحنیفہؒ تحت السّرہ یعنی ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو ترجیح دیتے ہیں[۱]۔ حضرت علیؓ کی روایت[۲] میں آتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ کے اُوپر اور ناف کے نیچے رکھنا سنت ہے۔ امام شافعیؒ ناف کے اُوپر ہاتھ باندھتے ہیں، یہ سب باتیں روا ہیں صرف ترجیح کا مسئلہ ہے بہر حال جو کوئی جس امام کا فتویٰ مانتا ہے اُسے اُس کے مطابق عمل کرنا چاہیئے اور دوسرے کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔

۴۔ فاتحہ خلف الامام

فاتحہ خلف امام بھی اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں اور بعض نہیں پڑھتے۔ امام اُبوحنیفہ کے قول کے مطابق امام کے پیچھے پڑھنے والا گنہگار ہوگا قرأت کرنا امام کا فریضہ ہے اور مقتدی کا فرض ہے کہ وہ خاموش رہے اور سنے[۳]۔ آئمہ اربعہ میں سے کوئی بھی فاتحہ خلف امام کو ضروری قرار نہیں دیتا[۴]۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں[۵] کہ سری نمازوں میں اگر مقتدی بھی سورۃ فاتحہ پڑھ لے تو بہتر ہے، یعنی سری نمازوں میں اُن کے نزدیک مستحب کا درجہ رکھتا ہے، کوئی فرض واجب تو نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی

---

[۱] ہدایہ ص ۶۵ ج ۱ [۲] مسند احمد ص ۱۱۰ ج ۱ [۳] ہدایہ ص ۷۶ ج ۱ [۴] مغنی ابن قدامہ ص ۵۵۷ ج ۱

[۵] مؤطا امام مالک ص ۶۸، المیزان الکبریٰ ص ۱۵۲ ج ۱

عرض کیا کہ دو امام یعنی امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ فاتحہ خلف امام کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے تشدد کیا ہے کہ جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھے گا۔ اس کی نماز ہی نہیں ہوگی یہ درست نہیں ہے کیونکہ نہ پڑھنے کے متعلق بہت سے دلائل ہیں اور قرآن کی آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نزدیک فاتحہ خلف امام ضروری ہے، نہ یہ کہ نہ پڑھنے والے پر عدم نماز کا فتویٰ لگا دیں۔ فاتحہ کا پڑھنا امام بخاریؒ کا مسلک ہے اور اس کے متعلق امام ترمذیؒ نے صاف کہا ہے[1] کہ بعض حضرات تشدد کرتے ہیں۔ عبداللہ ابن مبارکؒ نے بھی کہا ہے کہ جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہوتی ہے، اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

۵۔ تشہد اب تشہد کے بھی مختلف الفاظ آتے ہیں۔ کُل چھ یا سات روایات ہیں اور ان میں مختلف الفاظ ہیں۔ ہم جو عام طور پر پڑھتے ہیں اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبٰتُ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں[2] آتے ہیں۔ حضرت جابرؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں مختلف الفاظ آتے ہیں۔ بعض روایات میں[3] اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبٰرَكٰتُ الطَّيِّبٰتُ وغیرہ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ جن الفاظ سے بھی کوئی تشہد پڑھے گا۔ درست ہوگا۔ ایسے معاملات میں کسی کے ساتھ تعرض نہیں کرنا چاہیئے۔

۶۔ اذان اذان میں ترجیع کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے کوئی شہادت کے کلمات میں ترجیع کو اختیار کرتے ہیں اور بعض دوسرے نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہؒ عدم ترجیع کے قائل ہیں[4]۔ اسی طرح اقامت بھی کوئی پوری پڑھتا ہے اور کوئی مختصر کسی نے ایک پہلو کو راجح قرار دیا ہے اور کسی نے دوسرے پہلو کو۔ لہٰذا اس مسئلہ میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ الجھنا نہیں چاہیئے

۱۔ ترمذی ص ۷۱ ج ۱

۲۔ مسلم ص ۱۷۴ ج ۱، بخاری ص ۹۲۶ ج ۲ ۳۔ ترمذی ص ۶۵ ج ۱ ۴۔ ہدایہ ص ۷۰ ج ۱

کیونکہ یہ بھی صرف ترجیح کا مسئلہ ہے کہ کس طریقہ پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔

۷۔ حج

اسی طرح حج کا مسئلہ ہے۔ کوئی مفرد کو ترجیح دیتا ہے، کوئی تمتع اور کوئی قرآن کو۔ جس نے جو بھی طریقہ اختیار کیا، ٹھیک کیا، کسی کا بُرا نہیں منانا چاہیئے۔ اختلاف صرف ترجیح میں ہے کہ کون سا طریقہ افضل ہے۔ امام ابُو حنیفہؒ کے نزدیک حج قران افضل[1] ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے قران کیا تھا۔ امام شافعیؒ حج تمتع کے حق میں ہیں اور بعض آئمہ حج مفرد کو زیادہ افضل سمجھتے ہیں۔ اس مسئلے میں بھی خواہ مخواہ ایک دوسرے سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔ فروعاتِ دین میں اس قسم کے اختلافات کی بڑی گنجائش ہے۔

۸۔ بنی قریظہ کا واقعہ

ایک موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ[2] کو فوراً روانگی کا حکم دیا اور فرمایا تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے ادا نہ کرے۔ لوگ روانہ ہوگئے۔ چار میل کا فاصلہ تھا۔ راستے میں بعض صحابہؓ نے خیال کیا کہ وقت تنگ ہے، ہوسکتا ہے بنی قریظہ پہنچنے تک نماز ہی فوت ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے راستے میں ہی نماز ادا کر لی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ حضور علیہ السلام کے حکم کا مقصد فوراً کوچ تھا اور اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر نماز کے فوت ہونے کا خطرہ ہو تو راستے میں بالکل ادا نہ کرو۔ بعض دوسرے صحابہؓ نے حضور علیہ السلام کے ظاہری الفاظ پر عمل کیا اور بنی قریظہ میں ہی جا کر نماز ادا کی۔ جب یہ معاملہ آپ علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو آپ نے دونوں گروہوں کی تصدیق کی کہ دونوں نے ٹھیک کیا، کسی نے غلطی نہیں کی۔

مطلب یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں اختلاف کرنا جائز ہے۔ کوئی امام ایک طرف کو ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی ٹھیک ہے اُسے بھی ثواب ملے گا۔ اور اگر کوئی دوسرا پہلو اختیار کرتا ہے تو وہ بھی درست ہے۔ یہ فروعات دین ہیں، ان میں اختلاف

---

[1] ہدایہ ج ۱ ص ۲۳۷ [2] مسلم ج ۲ ص ۹۶

جائز ہے اصول میں اختلاف نہیں ہے۔ محض ہیئات کا اختلاف ہے جسے بعض حضرات بڑا طول دیتے ہیں اور مناظرہ بازی کرتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔ یہ ایک مسئلہ تھا جو میں نے عرض کر دیا۔

۲۔ حرف ض کا مخرج

دوسرا اہم مسئلہ حرفِ ض کے مخرج کا ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ میں دو دفعہ حرف ض آتا ہے۔ امام ابن کثیرؒ اور صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ ض کا تلفظ بڑا مشکل ہے۔ قاری حضرات بڑی مشق کے بعد اس کا صحیح تلفظ ادا کرتے ہیں۔ ض کا مخرج زبان کا کنارہ بالائی داڑھوں کی جڑ میں لگنے سے ادا ہوتا ہے اگر یہ مخرج صحیح طور پر ادا نہ ہو سکے تو پھر اس کی مشابہت ظ کے ساتھ آتی ہے د کے ساتھ نہیں ملتانی زبان میں تو ڈ پڑھتے ہیں، لہٰذا د کے ساتھ مشابہت درست نہیں۔ بہر حال چونکہ یہ مشکل حرف ہے، اس کو ٹھیک طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کرو۔ اگر نہ ہو سکے تو جس طرح بھی کوئی پڑھ لے گا، درست ہے۔ اس میں کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہونا چاہیئے۔ صوبہ سرحد میں گزشتہ صدی کے دوران پچاس سال تک اسی مسئلہ پر جھگڑا چلتا رہا اور قتل و غارتگری بھی ہوئی جو کہ ہرگز درست نہیں۔ برداشت کرنا چاہیئے۔

۳۔ کلام الٰہی ہونے پر اعتراض

تیسرا مسئلہ سورۃ فاتحہ کے کلام الٰہی ہونے کے متعلق ہے۔ فرقہ آریہ سماج کے پیشوا دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں [2] اور بعض عیسائیوں نے بھی یہ اعتراض اٹھایا تھا کہ یہ کیسی سورۃ ہے کہ اس کو اللہ کا کلام تسلیم کیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی تعریف بیان کر رہا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے اپنے حاشیہ قرآن میں اس اعتراض کا نہایت مختصر اور مدلل حل بیان کیا ہے [3]۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۲۰ ج ۱ [2] ستیارتھ پرکاش ص ۶۱۷ [3] موضح القرآن تفسیر سورۃ فاتحہ ص ۱

نے یہ سورۃ بندوں کی زبان پر نازل فرمائی ہے کہ وہ اپنے اللہ کے حضور اس طرح کہا کریں۔
یعنی اے میرے بندو! جب تم میرے سامنے مناجات کرنا چاہو تو ان الفاظ کے ساتھ کیا کرو۔
قرآن پاک میں اس قسم کا طرز کلام بعض دوسرے مقامات پر بھی ملتا ہے مثلاً سورۃ مریم میں آتا ہے وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ہم نہیں اترتے مگر تیرے رب کے حکم سے۔ اس آیت کریمہ کا سیاق و سباق کچھ اور ہے مگر یہ درمیان میں اس بات کا ذکر ہے کہ جس کا پتہ نہیں چلتا کہ کس کے اترنے کی بات ہو رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ آیت فرشتوں کی زبان میں نازل فرمائی ہے اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا[1] کہ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ آپ ہمارے پاس جلدی جلدی آیا کریں، ہمیں آپ کا انتظار رہتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرشتوں کی زبان پر نازل فرمائی، گویا فرشتے یوں کہتے ہیں۔ کہ ہم اپنی مرضی سے نہیں اترتے بلکہ اے پیغمبر علیہ السلام! ہم آپ کے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں، ہم اپنی مرضی سے نہیں آسکتے۔ مطلب واضح ہوگیا اور کوئی اشکال باقی نہ رہا۔

سورۃ فاتحہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ بندوں کی زبان پر نازل فرمائی ہے کہ اے میرے بندو! تم اس طرح کہو کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ غیر مسلم اور ملحد قسم کے لوگ ایسے غلط اعتراض کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھ اور ہدایت عطا فرمائے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِيْنُ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ

---

[1] مسند احمد ص ۲۳۱ ج ۱

معالم العرفان فی دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم۔اے علوم اسلامیہ)

زیر انتظام

انجمن محبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

جنرل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

خزانچی

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ

محمد منیر صاحب Ph: 4221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ